جلد (۳) - اگست ۱۹۰۲ء - نمبر (۵)

ایڈیٹر
شیخ عبدالقادر

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامین نثر

تحسین و نفرین - مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ۱
حکیم خاقانی شروانی - مولوی ابو الکلام محی الدین آزاد دہلوی از کلکتہ ۸
عبرتناک مشاہدہ - حضرت آغا شاعر دہلوی قزلباش از حیدرآباد ۱۸
تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں - مولوی ادریس احمد صاحب بی۔اے وارد رامپور ۲۵
تصویر کے دو رخ - ایڈیٹر ۳۰
طاقتِ خموشی - منشی رام رچھپال صاحب شیدا دہلوی لودیانہ ۳۸

مضامین نظم

آفتاب - محمد اقبال صاحب ایم۔اے ۴۲
مذہب اور سائنس (۲) منشی سراج الدین احمد صاحب گورنمنٹ پنشنر ۴۴
دنیا کی بے ثباتی سے سبق - پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی ۴۷
انجمن - ابو النصر مولوی غلام یٰسین صاحب آہ دہلوی ۵۰
کچکول ۵۴

نو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں
ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے -

خادم التعلیم پنجاب پریس لاہور میں منشی محمد عبدالعزیز کی اہتمام سے چھپا
اور شیخ عبدالقادر بی۔اے مالک و ایڈیٹر نے شائع کیا

مخزن

لاہور سے ہر ایک انگریزی مہینے میں ایک بار شائع ہوتا ہے۔ ملک کے مستند اور مشہور نامہ نگاروں
علاوہ ایک معقول تعداد نئے اور ہونہار اہل قلم کی اس کی اعانت میں مصروف ہے۔ یونیورسٹیوں کی ڈگر
پائے ہوئے اصحاب جن کو آج تک ملکی علم ادب سے غافل سمجھا جاتا تھا۔ شوق سے اسکے بنا
میں شریک ہو رہے ہیں۔ اور کوئی رسالہ ایسا نہیں ہوتا۔ جس میں کم از کم دو چار مضمون ڈگری
اصحاب کیطرف سے نہوں۔ مضامین عام دلچسپی کے ہوتے ہیں۔ اور کوشش کیجاتی ہی کہ ہر قسم کے
کے لئے کچھ نہ کچھ ہر پرچہ میں موجود ہو + رسالہ کا حجم (۱۸×۲۲) کی تقطیع پر (مع سرورق) ساٹھ
صفحہ کا ہی۔ قیمت عمدہ دبیز ولایتی کاغذ پر بلا محصول تین روپیہ ۳ اور دوم درجہ کے کاغذ پر دو روپیہ
اس حجم کا کوئی اور اردو رسالہ ایسی لکھائی اور چھپائی کے ساتھ ان قیمتوں پر نہیں دیا۔ محصولڈاک
دونوں صورتوں میں ۶ آنہ سالانہ ہے +

درخواست خریداری کے ساتھ پیشگی قیمت یا ویلیو پے ایبل کی اجازت آنی چاہیے۔ ادھار
کوئی حساب نہیں۔ نمونہ کے پرچہ کے لئے چار آنے کے ٹکٹ آنے چاہئیں۔ شیخ عبدالقادر مالک

شرح اجرت اشتہارات

مخزن اشتہارات کے لئے ایک نہایت عمدہ ذریعہ ہی۔ اس کے خریداروں کی لمبی فہرست میں پنجاب
لوگ بھی ہیں۔ اور صوبجات متحدہ و اودھ کے بھی۔ اضلاع دکن اور حیدرآباد میں بھی بکثرت بکتا ہے۔ اور وہاں کے
امراء و رؤسا کی ایک کثیر تعداد اس کے قدردانوں میں ہی۔ شمالی ہندوستان کے بھی معززین مسلمانوں کے اسمائے گرامی
اسکی فہرست میں شامل ہیں۔ اس کے ذریعہ اشتہار دینے والے حضرات جلد اس کی قابلیت اشتہار کا اندازہ
ایک سہ ماہی کے لئے آزما کر اگر فائدہ نظر آئے تو سال بھر کا معاہدہ کریں۔ اجرت اشتہارات فی صفحہ سال
کے معاہدہ کے لئے ۱۸ ششماہی کے لئے ۱۰ اور سہ ماہی کے لئے ۹ روپیہ۔ فی نصف صفحہ سال بھر
۱۰ روپیہ ششماہی کے لئے ۶ اور سہ ماہی کے لئے ۵ اتفاقی اشتہارات کے لئے ۲ فی سطر
شرح میں کمی کی گنجائش نہیں +

شیخ عبدالقادر مالک و ایڈیٹر

مخزن

تحسین و تنقیدیں

ہمارے مکرم جناب مرزا سلطان احمد صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جن کا فلسفیانہ سلسلۂ مضامین بعنوان تبادلۂ خیالات اوراقِ مخزن میں شائع ہو رہا ہے۔ اور قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل مضمون میں جو غور و فکر کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے اہل وطن کی طبیعتوں کے ایک نہایت نقصان دہ ضعف کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ امید ہے کہ ابنائے وطن اس پر غور فرماویں گے۔ اور یہ عادت پیدا کرنے کی کوشش کرینگے۔ کہ جو تحسین کا مستحق ہو۔ اُس کو فیاضی سے داد دیں اور جو قابل تنقید ہو۔ اُسے بیدھڑک تنقید کہیں۔ کیونکہ اس عادت کے راسخ ہونے کے ساتھ فی الواقع قومی ترقی ایک معقول حد تک وابستہ ہے :۔

خواہ ہم کسی قانون اور کسی مشرب کے پابند ہوں۔ خواہ معاد اور معاشرت دونوں کے قائل ہوں۔ اور خواہ صرف معاشرتی قوانین کو ہی مانتے ہوں۔ ہر حالت میں ہم اپنی چند روزہ زندگی میں اعمال اور افعال یا خیالات کا ایک مسلسل سلسلہ رکھتے ہیں ٭

جُوں ہی اس دنیا میں ہم وارد ہوتے ہیں۔ اس وُرود کے ساتھ ہی کسی نہ کسی طرح سے سلسلہ اعمال کا شروع ہو جاتا ہے۔ بہت سے ہمارے ایسے اعمال یا خیالات ہیں کہ جو دیگر نوعِ انسان کی نقاد نگاہوں سے مخفی رہتے ہیں۔ یا نوعِ انسان کو اُن کی نسبت رائے قائم کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ بہت سے ایسے اعمال یا خیالات ہیں کہ جو نوعِ انسان کی نگاہوں سے

گذرتے ہیں اور اُن پر ریویو کیا جاتا ہے ٭

خواہ ہم معاد کے قائل ہوں اور خواہ نرے معاشرتی قوانین کے متبع - دونوں حالتوں میں ہم نے اعمال اور افعال یا خیالات کے متعلق چند قوانین وضع کر رکھے ہیں - یہ بحث جُدا ہے کہ وہ قوانین بذاتہ کس حیثیت اور کس پایہ کے ہیں - اُن قوانین کے ذریعہ سے ہم اعمال اور افعال یا خیالات کا موازنہ کرتے رہتے ہیں ٭

اس عمل ایزان سے ہم بعض اعمال یا افعال اور خیالات کو اچھے قرار دیتے ہیں - اور بعض کو ناقص یا مکروہ - گو نقص و عمدگی اور حُسن و خوبی و زشتی کے تعین میں اکثر اوقات اختلاف پڑجاتا ہے - اور تاویلی قانون حسن و خوبی اور بدی و زشتی کے پیمانہ یا معیار کو مختلف ثابت کرتا ہے لیکن اس بحث کو جُدا رکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہمارا قانون یا اصول خواہ کچھ ہی ہو بہرحال اعمال - افعال اور خیالات کو وزن کیا جاتا ہے ٭

نوعِ انسان نے ضرورت - تجربہ - تاثیر - نتیجہ - اور حاصل کے لحاظ سے اعمال - افعال اور خیالات کے نام اور خصوصیات اور درجے مقرر کر رکھے ہیں - خواہ یہ تعینات معادی اصولوں کی تطبیق سے ہوں اور خواہ معاشرتی ضروریات کے اعتبار سے ٭

ہم بعض اعمال کو نیک کہتے ہیں - اور بعض کو بُرا - بعض کو خُوب قرار دیتے ہیں اور بعض کو زشت ٭

یہ تقسیم خواہ کسی حقیقت پر محمول ہو اور خواہ فرضی - اُس دائرے میں جہاں اس کی بنیاد رکھی گئی ہے - صحیح تسلیم کی جاتی ہے - اور طبیعتوں یا دلوں اور دماغوں پر اس کا ایک اثر ہوتا ہے اور قوم یا سوسائٹی کے اکثر امور معاشرتی یا معادی کا اس تاثر پر ہی انحصار ہے - نوعِ انسان اس وقت عموماً تین قسم کے قوانین کے تابع ہے :- ۱ - قانون معادی - ۲ - قانون معاشرتی ۳ - قانون حکومتی - جس تقسیم کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اُس کی بنیاد عموماً قانون معاد اور قانون معاشرت پر ہے - گو قانون حکومتی کے اکثر اجزا بھی انہی دونوں ضابطوں سے لئے گئے ہیں -

مگر وہ قانون بہرحال بمقابلہ ان دونوں قوانین کے ایک جبری قانون ہے ٭

اعمال ۔ افعال اور خیالات کا تنقیدی عمل اور اس تقسیم یا اثر کا بنیادی ضابطہ خود نوعِ انسان کی نیچرل آرزو یا خاصہ ہے ۔ نوعِ انسان بہ حیثیت مجموعی اور بہ حیثیت افراد چاہتی ہے کہ اس کے فعل اور ترکِ فعل پر ریویو کیا جائے اور ایک رائے قایم کی جاوے ٭

تعیینِ رائے سے انسان یا عامل کے دل میں ایک قسم کا قابلانہ یا نفرتی جوش پیدا ہوتا ہے ۔ یا یوں کہو کہ یا تو اس کے دل پر مایوسی اور بیزاری کا اثر ہوتا ہے اور یا امید اور خوشی کا سماں بندھ جاتا ہے ٭

جب دوسرے انسان یا دوسری طاقتیں ان دونوں حالتوں کی بابت کھلے الفاظ میں یا عملی طور پر اظہار کرتے ہیں ۔ تو انسان اس پر توجہ کرتا اور اس سے متاثر ہوتا ہے ٭

یہ اظہار دو ہی قسم کا ہوگا ۔ تحسینی الفاظ میں یا نفرتی جملوں میں ٭

نوع انسان جن اعمال ۔ افعال ۔ اور خیالات کو اپنے ضوابط کی رُو سے قبول کرتی ہے وہ تحسین کے مستحق ہوتے ہیں اور جن کو قبول نہیں کرتی وہ مستوجبِ نفرین ۔ ان حالات کے لحاظ سے ہمیں یہ کہنے کا حق حاصل ہے ۔ کہ انسان طبعاً تحسین سے خوش ہوتا اور نفرین سے ندامت حاصل کرتا ہے ۔ یا یوں کہو کہ نوعِ انسان طبعی طور پر تحسین کی آرزومند اور نفرین سے نافر ہے ۔ بعض حکیموں نے یہ بحث کی ہے کہ اعمال کا باعتبار تحسین اور نفرین کے فعل یا ترک بجائے خود ایک کمزور پولیسی ہے ۔ لیکن جس درجہ میں پہنچ کر ان حکیموں نے یہ رائیں قایم کی ہیں یا جس آفتابِ تحقق سے یہ کرنیں نکلتی ہیں وہ آسمانِ تحقق کا ایک اور ہی درجہ ہے ۔ معاشرتی ضروریات اور عروج و تنزل کے لحاظ سے ہر ایک فردِ نوعِ انسان تحسین کا خواہاں اور نفرین سے نفور ہے ٭

جو لوگ تحسین سے بھی نفرت گزیں ہو جاتے ہیں وہ اس آرزو کے **تارک** ہوتے ہیں نہ یہ کہ اُن میں طبعی طور پر یہ خواہش بھی نہیں ہوتی ۔ وجودِ آرزو اور شے ہے ۔ اور ترکِ آرزو

اَور شے ٭

ہر ایک قسم کے قانون میں جو انسان کے واسطے موضوع ہے تحسین اور تنفرین کا ضابطہ موجود ہے۔ معادی قوانین میں اُس کو اور الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ معاشرتی اور حکومتی ضابطوں میں اور طریق پر یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ نوع انسان کے اعمال اور افعال کا ریویو ہوتے رہنا انسانی ترقیات کی کل کا ایک اعلےٰ جزو یا ضروری پُرزہ ہے ٭

معادی قوانین میں سزا اور جزا کا ضابطہ دراصل ایک تحسین اور تنفرین ہے۔ یہ کہنا کہ ابن فعل سے جنت ملیگی اور ابن ترکِ فعل سے دوزخ۔ تحسین اور تنفرین کی تفصیل کی ایک صورت ہے ٭

حکومتی قوانین میں یہ ذکر کہ جو شخص اِن افعال کا مرتکب ہوگا۔ اُس کی پاداش یہ ہوگی۔ اور جو یہ کریگا اُس کا انعام یہ۔ درحقیقت بالفاظ دیگر تحسین اور تنفرین کی ہی تبلیغ ہے۔ انسان کا کوئی کام ایسا نہیں ہے۔ کہ جس میں اصولِ معاد یا معاشرت کے اعتبار سے تحسین اور تنفرین کی ضرورت نہ ہو ٭

ایک فلسفی کہتا ہے کہ ہر ایک مہم اور ہر ایک امر کے لئے تحسین اور تنفرین دو عملی علاج ہیں اِن عملوں سے معاشرتی مشین ہمیشہ اپنے اصلی مرکز پر قایم رہتی ہے۔ تحسین سے غرض یہ ہے کہ جو شخص ایک کام میں مصروف ہے یا جو جماعت ایک کام کر رہی ہے وہ حوصلہ اور امید کے ساتھ بدستور اپنا کام کرتے ہیں۔ اور اُن کے حوصلہ اور ہمت میں روز افزوں ترقی اور افزائش ہوتی جاوے۔ اور دوسرے افراد کو بھی اُس روش پر چلنے اور عمل کرنے کی تحریص اور ترغیب ہو ٭

تحسین ترقی کی ماں اَور اقبال و احترام کی کُنجی ہے۔ اور انسان کی کوششوں اور مساعی کا ایک باضابطہ معاوضہ۔ تحسین کا نعرہ درخواست اور التجا سے نہیں نکلتا۔ بلکہ نوعِ انسانی سے خود ہی بے اختیار وقت پر نکلا جاتا ہے۔ ایک آدمی اچھا کام کرتا ہے اور لوگ خود بخود

ہی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں - ایک اکھاڑے میں ایک پہلوان اچھے داؤ چلتا ہے - ناظرین بلا درنگ آہاہا کہہ اٹھتے ہیں ٭

ایک اچھا نمونہ ایک اچھی چیز ایک دلکش سماں ایک خوبصورت آدمی ایک اچھی نظم ایک دلاویز گیت دیکھتے اور سنتے ہی ہر انسان اپنے اپنے مذاق کے موافق طبعی جوش سے رائے زنی اور واہ واہ پر آمادہ ہو جاتا ہے - ایک شاعرِ شیریں مقال یا واعظِ صوفی خصال کے ترکیب دادہ الفاظ کے سنتے ہی کیوں دلوں میں اثر ہو جاتا ہے اور کیوں درد کی ہوائیں رگ و ریشہ میں دورہ کرنے لگتی ہیں - وہ کون سی طاقت ہے جو انسان کو راہ جاتے ٹھیرا لیتی ہے اور اس کے منہ سے بے ساختہ یہ تحسینی الفاظ کہلواتی ہے ؟ یہ وہی طاقت اور یہ وہی جوش ہے جو انسان کے دل میں طبعی طور پر تحسین اور نفرین کے نام سے پایا جاتا ہے - تحسین کے مقابلہ میں نفرین ایک دوسری قسم کا معاوضہ ہے - اگر ایک آدمی اچھی حالت میں اچھے معاوضہ کا حق دار ہے - تو بری حالت میں برا معاوضہ بھی دیا جا سکتا ہے - دوسرے الفاظ میں تحسین قدردانی یا قدر افزائی ہے - اور نفرین بے قدری یا تذلیل - نفرین سے برائیوں اور ناقص خیالات کا انسداد ہوتا ہے اور نوعِ انسان پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ ایسے افعال سے ایسے نتیجے پیدا ہوا کرتے ہیں ٭

جو قومیں تہذیب یافتہ ہیں اور اخلاقی جرأت (مورل کریج) رکھتی ہیں - ان میں تحسین اور نفرین کو عملی طور پر معرضِ اظہار میں لانے کا رواج ہے - اور ان دونوں عملوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے - لیکن جن قوموں میں ابھی اخلاقی جرأت کی کمی ہے - ان میں باوجود اِس مادہ کے موجود ہونے کے اس سے عملی فائدہ نہیں اٹھایا جاتا ٭

وہ امور جو سود مندی یا ناسود مندی کے لحاظ سے مشترکہ اغراض کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ امور جو قریباً منفردانہ ہیں ان دونوں کی نسبت تحسین اور نفرین کے نام سے یہ ہونا چاہیئے جو لوگ قوم یا ملک کے واسطے کسی قسم کا کام کر رہے ہیں یا ان کا وجود باعتبار بعض ضروریات مفید ہے

ضروری اور لابدی ہے۔ کہ اُن کے کاموں کو ہمیشہ تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جاوے۔ اور جس معاوضہ کے وہ مستحق ہیں وہ اُن کو دیا جاوے۔ اور جو نفرین کے قابل ہیں۔ اُن سے عملی نفرت کا اظہار کیا جاوے ٭

اچھائی کی ترویج یا بُرائی یا نقص کے انسداد کے لئے جیسے عام تحسین اور نفرین کی ضرورت ہے۔ اور جیسے اِس کا اثر ہوتا ہے اور کسی عمل کا نہیں۔ یہ صورت اُس وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ جب ذاتیات کی بحث کو الگ رکھا جاوے اور قومی کاموں اور سوسائٹی کی ضروریات کو ایک جداگانہ مشرب سمجھ کر رائے زنی کی جاوے ٭

جن ملکوں اور جن قوموں میں تحسین اور نفرین کا صادق عمل جاری نہیں ہے وہاں گویا گیہوں اور جو کا ایک ہی بھاؤ ہے۔ ایسے ملکوں کی انجمنیں۔ کارخانے۔ اخبارات۔ رسالے۔ مصلح۔ ہمدرد۔ کیوں کامیاب نہیں ہوتے؟ اور کیوں اُن کی محنتوں۔ مساعی۔ اور خیالات میں مایوسی غالب رہتی ہے؟ صرف اِس وجہ سے کہ اُن کی خدمات کا اُن کی قوم منصفانہ اندازہ نہیں کرتی ٭

جو لوگ بدکُن اور اخلاق سوز خدمات رکھتے ہیں پبلک اُنہیں اُنہی نظروں سے دیکھتی ہے جن سے اچھوں کو دیکھتی ہے۔ اِس حالت میں اُن کو کوئی تنبیہ یا تادیب نہیں ہوتی ٭

جب تک عملی طریقوں سے نیکی کو ترقی اور بدی کو شکست نہیں دیجاویگی۔ تب تک قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ جو لوگ اچھا کام کرتے ہیں وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اُن کی تحسین کی جاوے۔ اور اُن کے حوصلوں کو بڑھایا جاوے۔ اور جو لوگ خود غرضی سے اِس میدان میں آتے ہیں۔ ضرور ہے کہ اُن کو نفرین کی نگاہوں سے دیکھا جاوے۔ ہمارے اعمال نوعِ انسان سے کیا چاہتے ہیں۔ منصفانہ ریویو۔ نوعِ انسان کی طرف سے ہمیں کیا مِلنا چاہیئے؟ تحسین یا نفرین۔ تحسین اور نفرین کا کیا اثر ہے؟ تحسین ہمارے ارادوں کو

بڑھاتی اور ہماری ہمت میں قوت بخشتی ہے۔ اور اس سے دوسروں کو بھی اچھے کاموں کی ترغیب ہوتی ہے۔ نقرین ہمیں بُرائیوں اور کم ہمتیوں سے باز رکھتی ہے اور آدمیوں کو عبرت دلاتی ہے ٭

اگر ایک انجمن۔ یا ایک اخبار یا ایک رسالہ قوم کی خدمت کر رہا ہے۔ تو وہ اُس صورت میں ترقی پا سکتا ہے کہ جب پبلک اُس کی خدمات کا ریویو کرتے ہوئے اُس کی تحسین اور ہمت افزائی کا باعث ہو۔ جو شخص اچھا کام کرتا ہے۔ جو جماعت اچھی خدمات پیش کر رہی ہے۔ ضرور ہے کہ اُس کی داد دیجاوے۔ جو شخص اپنی خدمات کی داد چاہتا اور اپنی قدر افزائی کا آرزومند ہے۔ وہ ایک طبعی خواہش کا خواہشمند ہے ٭

ہماری ترقی اور ہماری رونق صرف تحسین اور نقرین کے دو الفاظ کے قیمتی فلسفہ پر مبنی ہے ٭

سلطان احمد

تارے سے گفتگو

ٹمٹم کرتے چھوٹے ستارے
حیراں ہوں تو کیا ہے پیارے

دنیا سے اُونچا بادل میں۔
ہیرا سا کالی مخمل میں۔

ناز سے آنکھیں جھپکنے والے
حسن میں اپنے دمکنے والے

اندھیرے میں حق کی شان ہے تو
راہی کی جان کی جان ہے تو

سر پہ سبھوں کے چمکنے والے
آنکھوں پہ سب کے رہنے والے

کس صناع نے تجھ کو بنایا
کس نے تجھ میں جلوہ دکھایا

صانع کو تیرے کس سے پوچھوں
جانی کو اپنے کس سے پوچھوں

کیسے کوئی پتا بتلا دے
کوچے کی اُس کے راہ لگا دے!

پیارے کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں
پاؤں پڑوں اُن ہاتھوں کو چوموں

(نذیر حسین احمد)

حکیم خاقانی شروانی

شعرائے پارس کے تذکرے اگرچہ فارسی زبان میں بہت سے لکھے گئے اور اکثر مشہور شعرا کے حالات ہر ایک تذکرہ نویس نے قلمبند کئے مگر سچ پوچھو تو جامعیت کا اطلاق ایک تذکرے پر بھی نہیں ہو سکتا۔ ہندستان میں آزاد بلگرامی نے خزانہ عامرہ بڑی محنت سے لکھا تھا اور دعوے کیا تھا کہ کم و بیش تمام خوشگو شعرائے فارس کے حالات اس میں جمع کئے گئے ہیں مگر جب دیکھنے والوں نے دیکھا تو سوائے چند مشہور شاعروں کے حالات کے اور کچھ نہ پایا۔ اور یہ کچھ الزام آزاد ہی پر نہیں ہے بلکہ تمام تذکروں کی یہی کیفیت ہے۔ حال میں علامہ ہدایت نے ایک ضخیم تذکرہ مجمع الفصحا کے نام سے ایران میں لکھا ہے اور وہیں چھپا بھی ہے۔ ہم نے اُسے بھی اول سے آخر تک چھان ڈالا۔ بہت سے شاعروں کے حالات نظر نہ آئے۔ خیر یہ تو حال فارسی تذکروں کا ہے۔ اردو کے معلے تو اپنے شاعروں کے مذاکرے سے بھی محروم تھی یہ تو پروفیسر محمد حسین آزاد کی عنایت ہے کہ اُنہوں نے آبِ حیات لکھ کر کلنک کا ٹیکہ مٹایا۔ ہم نے یہ حال دیکھ کر ایک تذکرۃ الشعرا کی بنا ڈالی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اُس میں جامعیت کا لطف پیدا کیا جائے۔ ساتھ ہی پرانی طرز کو ترک کر کے سوانح کے عمری کے طور پر حالات لکھنے کا اہتمام کیا گیا ہے اور مختلف مقامات سے تذکرے جمع کر کے پہلی جلد تالیف کی گئی ہے۔ جس میں سے نمونہ کے طور پر حکیم افضل الدین خاقانی کی لائف ناظرینِ مخزن کی دلچسپی کے لئے پیش کیجاتی ہے +

(ابو الکلام آزاد دہلوی از کلکتہ)

زدیوانِ ازل منشور کاول در میان آمد ✿ امیری جملہ را او ند و سلطانی بخاقانی
برائے حجتِ معنی براہینے پدید آمد ✿ ز نشتِ آرزو صنعت علی نجار شروانی

آج ہم اُس افصح الفصحا و اشعر الشعرا کے حالات رقم کرتے ہیں جو چرخ فصاحت کا بلند پرواز شہباز تھا۔ اور نیستانِ بلاغت کا ایک دلیر شیر تھا جس نے نہ صرف نظم پارس میں فصاحت و بلاغت کی رُوح پھونکی بلکہ اُس کو نازک خیالی کے بوتہ میں ڈال کر کدورتوں سے

صاف کیا اور ایسا صاف کیا کہ اُس کی چمک دمک پر سیکڑوں کی نظریں پڑنے لگیں۔ اور جس جوانمردِ سخن نے نظم پارس کو رباعی اور غزل کی قید سے آزاد کر کے ترقی کے اعلےٰ مینار پر پہنچا دیا ✦

اس شیر بیشۂ بلاغت کا نام نامی حکیم افضل الدین ابراہیم بن علی النجار شیروانی ہے اصل آبائی وطن اُس کا بیلقان ہے لیکن (غالباً) زیادتی سکونت کے سبب سے شیروانی مشہور ہو گیا۔ رشید الدین وطواط و اثیر وظہیر اور فخر الدین وشاپور و کمال الدین کا ہمعصر ہے لیکن اپنے کمال کے سبب سے سب سے بدرجہا فوقیت لے گیا۔ اس کی صحیح تاریخِ ولادت باوجود تحقیق و تجسس بسیار نہ معلوم ہوئی۔ تذکرہ مرآۃ الخیال۔ خزانہ خیال خزانہ عامرہ تذکرہ دولت شاہ ریاض الشعرا علامہ قہستانی۔ آتشکدہ تذکرہ مجمع الفضلا مآثر الامرا صبح صادق گلزار عجم ارمغانِ شعرا یادگار شعرا تحفۃ العجم کلام مقبول یادگار ناظم وغیرہ وغیرہ تمام تذکرے چھان ڈالے مگر کچھ پتا نہ چلا۔ مجمع الفصحا مطبوعۂ ایران تالیف علامہ فخر المتاخرین رضا قلی خاں ہدایت سے اتنا پتا بیشک چلتا ہے کہ پانچویں صدی کے اوائل میں یہ صبح صادق کا چمکتا ہوا تارہ عالم اجسام کے آسمان پر نمودار ہوا اور اہل عجم کے لئے نیر اعظم ہو کر چمکا جس کی روشنی نے نہ صرف مشرق ہی کو روشن کیا بلکہ اپنی تیز شعاعوں سے اہل مغرب کی بھی آنکھیں روشن کر دیں ✦

ہمارے ناموَر ہیرو کے والد کا پیشہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے غالباً نجاری تھا۔ کیا عجب ہے کہ آبا و اجداد کا بھی یہی پیشہ ہو مگر اس بارے میں تمام تذکرہ نویس خاموش ہیں ✦

جب ہمارا ہیرو سن تمیز کو پہنچا تو تحصیل علوم ضروری کے بعد اپنے خسر اور واجب التعظیم بزرگ ابوالعلائی گنجوی کی خدمت میں حاضر ہو کر علوم ادبیہ اور حکمیہ حاصل کرنے لگا طبیعت کی موافقت اور ذہن کی رسائی تو فطری تھی پھر اُستاد کامل اور شفیق ملا دن دونی رات چوگنی ترقی ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصہ میں فضل و کمال کا دریا بہا دیا ✦

انسان کا قاعدہ ہے کہ جس قسم کی سوسائٹی میں وہ ہوش سنبھالتا ہے اور جس قسم کی باتوں میں

آنکھیں کھول کر اپنے کو مبتلا دیکھتا ہے اُسی طرف اُس کا قلبی رجحان ہوتا ہے اُس زمانہ میں شاعری کی مار مار تھی اور تمام علوم میں شاعری کو فضل سمجھا جاتا تھا۔ فردوسی اور اُس کا شاہنامہ محمود غزنوی کی حکایتیں اور اُس کا دربار اُس زمانہ میں ایسا تھا جیسے آج کل غالب و ذوق اور مرحوم بہادر شاہ جیسے آج کل اُن کی حکایتیں مشہور اور معروف ہیں اور اُن کے دیکھنے والے ابھی تک موجود ہیں اسی طرح اُس زمانے میں فردوسی اور محمود غزنوی کی حکایتیں زبان زد خاص و عام تھیں۔ ہر ایک شخص کو شاعری کا شوق و ذوق تھا اور اسی خیال میں سرمست تھا جس علمی مجلس میں جاؤ تو وہاں منطق اور فلسفہ کی پریشان کن دماغ بحثوں کی بجائے شاعری کی خوش کن بحثیں ہوتی نظر آئینگی۔ جس دربار میں پہنچو اسی شاعری کے دلکش راگ گاتے ہوئے دکھائی دینگے۔ خون لگا کے شہیدوں میں داخل ہونا آج ہم کہتے ہیں لیکن اس مثل کا سچا مصداق وہی زمانہ تھا اور یہی نہ تھا کہ لوگ شہیدوں میں داخل ہو جاتے تھے بلکہ شہید ہو بھی جاتے تھے ہر ایک شخص یہی چاہتا تھا اور اعلےٰ سے اعلےٰ خدا تعالےٰ سے اُس کی یہی دعا ہوتی تھی کہ میں فردوسی ہو جاؤں ٭

الغرض ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کا نیّر اقبال نصف النہار ہو رہا تھا اور خاندان سلجوقی کا دَور دَورہ تھا اور اس خاندان عالیشان پر فن شاعری کا راج تھا۔ ہمارے نامور ہیرو نے علم و فضل حاصل کیا اور علامہ ابو العلائی گنجوی سے اکتساب فیضان کیا۔ جیسا کہ ضرور تھا۔ بعد فراغ کتب درسیہ اس کو شاعری کی طرف میلان ہوا جس پر زمانہ مصر ہوا تھا اور جس سودا میں خویش و بیگانہ مست نظر آتا تھا ٭

استاد کی رائے باکمال اُستاد نے بھی دیکھا کہ نوجوان طالب العلم ہے تو ذہین طبیعت کی شوخی بتا رہی ہے کہ شاعری کے پردے میں اپنا رنگ دکھلانا چاہتی ہے اور کسی کے رد کے سے کب رُکیگی بن دکھائے نہ رہیگی۔ اور یقیناً دکھائیگی کبھی کسی باکمال کی ہجو ہوگی۔ کبھی خشک زاہدوں کی مٹی خراب ہوگی اور ایسے بُرے طور سے کہ توبہ بھلی۔ کبھی واعظوں۔ ناصحوں اور عشاق پر پھبتی اُڑیگی اور اُس میں بال کی کھال کھینچی جائیگی۔ پس خداداد موج کا روکنا ایک تو غیر ممکن ہے اور

چلتی ندی میں کچھ اٹکا بھی دیا جائے تو نتیجہ اُس کا خراب ہے بہتر ہے کہ اسی فن کی جانب میلان اُس کا اور بڑھایا جاوے ٭

شاعری ہمارے تہبرو نے جب اپنے شفیق اُستاد کا اشارہ پایا تو اُونگھنے کو ٹھیلنے کا بہانہ پھر کیا تھا ادھر تو پہلے ہی سے اشتیاق سے بھری آنکھیں حکم کی منتظر تھیں فوراً حقایقی تخلص تجویز کر کے کچھ اشعار لکھے اور اُس زمانہ کے مشہور شاعر فلکی سے شاگردی کر کے اصلاح لینی شروع کردی ٭

شاعری سے طبع کی مناسبت شاعری کی آگ تو پہلے ہی سے طبیعت میں موجود تھی ۔ لیکن علوم درسیہ کے مشاغل کے سبب سے کچھ دنوں خاک تلے دبی رہی جب تحصیل سے فارغ ہوا اور اُستاد کو بھی موافق دیکھا وہ آگ ایک شعلہ زرافشاں کی صورت میں بھڑکی اور بھڑکتے ہی گلزار ابراہیمی کی بہار دکھلانے لگی ۔ پھر تو اُس کے تر و تازہ گلابی خوشبودار خوش رنگ خوش نما پھولوں کی مہک نے تمام ملک سخن کو معطر کر دیا اور زبان حال سے وہ تر و تازہ گلشن سخن شایقانِ سخن کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ ۔ " اے گلشنِ سخن کے ہوا خواہ شایقو ! ! آؤ اُو بہار بے خزاں کے مزے لوٹو ! ٭

قسمت کی رسائی تو دیکھو جب یہ شہرتِ سخن عالمگیر ہوئی اور لوگ اُس کے کمالات سے واقف ہونے لگے تو اُس کا غلغلۂ کمال سلجوقی خاندان کے نامور قدردانِ سخن بادشاہ خاقان کبیر منوچہر الپ ارسلان سلجوقی شاہ شیرواں تک پہنچا اور وُہ اُس باکمال حقایقی کی جانب متوجہ ہوا اُس نے بھی اس توجہ کو غنیمت خیال کیا اور قصائد مدحیہ لکھ کر خاقان کبیر کے دربار میں حاضر ہوا اور قصائد نذر گذرانے ۔ اقبال نے ہاتھ پکڑا ۔ اور قسمت نے یاوری کی ۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ اُس سلجوقی دربار میں اُس کا وہ رسوخ ہو گیا جو فردوسی کو محمود کے دربار میں یا ابوالفضل و فیضی کو اکبری دربار میں تھا بلکہ اُس سے بھی بدرجہا زیادہ ٭

زمانہ چاہتا تھا ۔ اور فردوسی و محمود کی کیفیت سُن سُن کر خواہش کرتا تھا ۔ کہ ۔ ہم فردوسی ہوں اور کوئی محمود سا قدرداں ملے ۔ ظاہر ہے کہ حسب خیال زمانہ حقایقی کو بھی کبھی اس کا خیال ہوا ہو گا لیکن

اپنی حیثیت یا کسی اور ناکامیابی کے خیال سے یہ نتیجہ نکالا ہوگا۔ کہ ایسا ناممکن خیال سوا اسکے کہ دل کو خوش کرلے اور کامیابی کا خوش نما پہلو نہیں رکھتا۔ لیکن قسمت کی یاوری نے دکھا دیا۔ کہ کچھ محمود اور فردوسی ہی پر موقوف نہیں۔ ہماری مدد چاہیئے پھر تو کیسا ہی ناقدردانی کا زمانہ کیوں نہ ہو۔ ایک چھوڑ پچاس فردوسی اور محمود ہو سکتے ہیں +

قسمت کی نصیحت اور پیشین گوئی

دیکھو!! ہمارے مشکور رہو ہم نے تم کو فردوسی وقت بنا دیا۔ اور پھر اس سے تمہارا وقار اور تمہاری عزت دربار میں زیادہ ہے۔ خاقان کبیر کو محمود وقت بنا دیا۔ مگر اس کی محبت اور شفقت تم پر بہ نسبت شفقت محمود بر فردوسی کے زیادہ ہے دیکھو!! خبردار! خبردار!! فردوسی سا غرور نہ کرنا۔ ورنہ وہی حال ہوگا جو فردوسی کا اُسی قدردان اور مشفق محمود غزنوی کے ہاتھوں ہوا تھا۔ اور آخرکار وہ بڈھا فاضل طوسی یہی کہتا ہوا دل کی بھڑاس نکالتا تھا +

چو سی سال بردم بشاہنامہ رنج — کہ تا شاہ بخشد مرا تاج و گنج
اگر شاہ را شاہ بودے پدر — بسر بر نہادے مرا تاج زر
چو اندر تبارش بزرگی نبود — نیارست نام بزرگاں شنود

دیکھو!! کہیں تمہیں اسے لکھنے کی ضرورت نہ ہو!" قدرت کے ہاتھوں کسے چارہ آخر وہی ہوا جو قسمت مقدس نے پیشین گوئی کی تھی +

خاقانی تخلص دربار شاہی سے عطا ہوتا ہے

اب تو کچھ اور ہی عالم نظر آتا تھا۔ روز و شب مدحیہ قصائد لکھے جاتے ہیں اور صلے میں ہزاروں روپیہ عطا ہو رہے ہیں۔ چنانچہ خاقان کبیر کے ہاں مقرر تھا کہ فی قصیدہ ایک ہزار درم صلہ میں دیا جائے۔ اور زر و جواہر اس کے علاوہ ہیں!!!

لسان الغیب نے کیسا سچ کہا ہے۔ ع قبولِ خاطر و لطف سخن خدا داد است + ہمارے اس نامور ہیرو کا تخلص پہلے تو "حقایقی" تھا۔ لیکن شاہ خاقان کبیر نے خاص اپنی عنایت

بنیابت کے ثبوت میں خاقانی تخلص عطا فرمایا۔ تقدیر پکار رہی تھی ہاں یا ایہاالشاعر!
خاقان کبیر اپنی مملکت کا بادشاہ اور خاقان ہے۔ تو تم ملک سخن کے پادشاہ اور خاقانی ہو
اللہ مبارک کرے"۔ ہمارے اِس حقایقی کے زمانہ عروج میں خیال کیا جاتا تھا۔ کہ وہ:۔

"حکیم افضل الدین ابراھیم بن علی شاہِ مملکتِ سخن محبوبِ خاقانِ کبیر خاقانی اعظم ہے"۔

غرور اور بے ادبی قاعدہ ہے کہ کمال کے ساتھ غرور بھی آجاتا ہے۔ خصوصاً فنِ شعر کا تو خاصہ ہے کہ جہاں اس میں کمال ہوا۔ وہیں کمبخت غرور نے آلیا۔ میر و سودا کا بھی یہی حال تھا۔ ایسے کریم النفس بہت کم نکلینگے جنہیں نام کو بھی غرور نہ ہو۔ بدقسمتی سے خاقانی کے دل میں بھی غرور آگیا۔ کہ ہم وہ ہیں کہ قبولیت سخن میں سب ہم سے کمتر ہیں۔ دربار میں وہ وقعت ہے کہ کسی اعلےٰ سے اعلےٰ عامل یا حاکم کو نہیں ہے۔" اس لغو خیال کا آنا تھا کہ خاقانی کا رنگ ہی بدلگیا۔ اور کسی کو اپنی نظر میں لانا ہی چھوڑ دیا۔ پہلے پہل اپنے اُستاد معلم علامۂ ابوالعلائی گنجوی سے دو دو کی ٹھیرادی۔ بھلا ہمارے ہاں کے نصیر و ذوق کی لڑائی کیا حقیقت رکھتی ہے ایسی تُو تُو مَیں مَیں ہوئی کہ توبہ بھلی۔ اس تُو تُو اور مَیں مَیں کے سبب حکیم افضل الدین خاقانی نے۔ اور ہائے اُسی خاقانی نے علامۂ ابوالعلائی گنجوی کی۔ اور ہائے ہائے اپنے اُستاد کی "ھجو" لکھی۔ اور بُری لکھی۔ اگرچہ اُدھر سے بھی جواب کی ٹھیرائی گئی۔ لیکن اِدھر کی زیادتی خلق اللہ میں مشہور ہوگئی۔ خاقانی کے ہواخواہ کہتے ہیں کہ پہلے ابوالعلائی کی جانب سے چھیڑ ہوئی۔ اول تو یہ بالکل خلاف ہے۔ مگر ہم مان لیتے ہیں کہ اچھا اُسی کی جانب سے پہلے پہل چھیڑ سہی۔ لیکن ابوالعلائی خاقانی کا کون تھا؟ اُستاد تھا۔ خاقانی ابوالعلائی کا کون تھا؟ شاگرد تھا۔ پس اگرچہ ابوالعلائی نے پہلے زیادتی کی ہوتی مگر خاقانی کو ہرگز ہرگز ہجو نہ لکھنی چاہیئے تھی۔ جو کچھ ہو آخر اُستاد تھا۔ حضرت امیر المومنین علیؑ فرماتے ہیں کہ جس نے مجھ کو ایک حرف بھی سکھایا ہے تو وہ میرا آقا ہے میرا مولا ہے۔ مَیں اُس کا غلام ہوں!!! مقام غور ہے کہ ابوالعلائی تو وہ شخص تھا

جس نے اسے خاقانی بنایا۔ اُس کو بچپن سے پڑھاتے پڑھاتے فراغت کرائی۔ تمام علوم درسیہ کی جس کی خدمت میں اور جس زبان سے خاقانی نے تحصیل کی وہ ابو العلا کی خدمت اور اُسی ابوالعلائی گنجوی کی زبان تھی۔ کہاں تو ایک حرف کی تعلیم سے معلم آقا کی بجائے ہو جاتا ہے اور ابو العلائی نے تو دفتر کے دفتر خاقانی کو سکھائے تھے۔ بھلا کیا وہ اس لائق بھی نہ تھا۔ کہ اپنے بڑوں کا جیسے زبانی ادب ہوتا ہے ویسا ہی اُس کا بھی کرتا۔ اور اُس کے حق میں بدزبانی نہ کرتا۔ ادب ایک ایسی چیز ہے کہ انسان کو فضائل کا منبع بنا دیتی ہے۔ ہمارے بزرگوں سے کیسے کیسے ادب کے کام سرزد ہوئے ہیں۔ کہ آدمی انہیں بلا مبالغہ مبالغہ کہدے حالانکہ وہ واقعی سچی باتیں ہیں۔ صرف دل سمجھنے والا اور دماغ غور کرنے والا ہونا چاہیئے۔ حدیث میں ماں باپ کے ادب کو ضروری ہونا۔ اور اُن کی رضامندی کو باعث نجات ہونا اس پیرایۂ لطیف میں بیان کیا ہے۔ کہ ماں باپ کے پاؤں تلے جنت و دوزخ ہیں۔ یعنی اُن کی رضامندی باعث عطائے جنت اور ناراضگی باعث ادخال دوزخ ہے ماں باپ تو جسمانی محسن ہیں۔ اور اُستاد روحانی محسن۔ کیا اُس کی ناراضگی باعث جہنم نہ ہو گی؟ مولانا روم کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں ؎

از خدا خواہیم توفیقِ ادب	بے ادب محروم ماند از لطف رب
بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد	بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

قسمت کی پیشین گوئی ٹھیک اُتری الغرض مقدس قسمت کا کہا ٹھیک اُترا۔ اور اس اپنے اُستاد شفیق کی ہجو نویسی کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اقبال کا چمکتا ہوا ستارہ ڈوبنے لگا۔ اور تقدیر کی بلندی کا آفتاب غروب ہونے کو آیا۔

اُستاد کی بے ادبی کی تو نتیجہ بھی برا پایا خاقانی کی عمر اب زیادہ ہو چلی تھی۔ اور اب باعتبار سن و بہ تقاضائے وقت۔ حسب قاعدہ کچھ اور ہی رنگ چڑھ گیا تھا طبیعت میں حقائق و معارف کا دریا جوش زن تھا بات یہ ہے۔ کہ شاعری کے کمال کی آخری سیڑھی حقیقی عشق ہے۔

درمزے دار صوفیانہ خیال ہیں۔ مجازی عشق کی باتیں شاعری میں زیادہ تر ہُوا کرتی ہیں۔ ...سی یہ ترقی کا نام عشق حقیقی ہے۔ جیسا کہ کہا گیا۔ کہ المجاز قنطرة الحقیقة۔ اس کا لطیف ترجمہ دیکھنا ہو۔ اور وہ بھی نظم میں۔ تو راقم الحروف آزاد کا یہ اردو شعر دیکھ لو!

ہوتا ہے مجازی سے حقیقی کا توصل ہے نفع بھی اس عشق کے ہمراہ ضرر میں

مجازی اور جھوٹی محبت میں عمر کا گرانمایہ حصہ تمام ہُوا تھا۔ دل نے کہا کہ "تمام عمر تو اس جھوٹے ور مجازی عشق کے بیان اور پرستش میں گذری۔ لاؤ اب اسی آخری عمر کو عشق حقیقی کے مشغلہ میں صرف کریں۔ بس یہی خیال شعرا کو حقائق و معارف تک پہنچاتا ہے۔ پھر اُس وقت کے کلام میں ایک خاص لطف ہوتا ہے۔ جو کبھی لسان الغیب اور کبھی اسرار الغیب کبھی بُلبُل شیراز کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سعدی حافظ جامی خسرو نظامی گنجوی وغیرہ کے عشق حقیقی کے بیانات اور محبت الٰہی کے ارشادات اسی قبیل سے ہیں ✤

خاقانی پر بھی آخرالامر یہی حالت طاری ہوئی۔ اور یہی خیال غالب ہُوا۔ پھر تو تصوف کے نگین اور حقائق سے بھرے ہوئے خیالات ہیں اور خاقانی کا دل۔ اس کا دل ہے اور عشق حقیقی کا لگاؤ۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ جب تک اہل دول کی صحبت اور جھوٹی مدح کا راگ گایا جاتا ہے ب تک یہ خوش نما رنگ رنگ نہیں پکڑتا۔ اس رنگ کے لئے اس سے علحدگی چاہیئے ✤

...رفتاری

الغرض اسی خیال سے خاقانی نے خاقان کبیر اپنے ممدوح سے رخصت چاہی۔ ...ھر صحبت خاقانی کا لطف کہاں فراموش ہو سکتا تھا۔ کہا "یہ تو غیر ممکن ہے" خاقانی ...ب اس میں ناکامیاب رہا۔ تو دوسری کوشش شروع کی۔ اور پوشیدہ فرار کرنے کی ...یرائی۔ ایک دن وقت دیکھ کر وہاں سے اس نے فرار کیا۔ اور شہر بیلقان جو اس کا اصل وطن تھا پہنچا۔ اور شکرانہ بجا لایا کہ محبت اہل دول سے نجات پائی اور بخیر و عافیت اپنے وطن پہنچا۔ لیکن قسمت کا لکھا پورا ہونا تھا۔ اور ہجو استاد کی ایک بار سزا پائی تھی۔ شاہی کارندوں نے ...طلع ہوتے ہی خاقانی کو گرفتار کر لیا۔ اور اُسے خاقان کبیر تک پہنچا دیا ✤

افسوس غضب سلطانی نے قید کی ٹھیرائی۔ ہر چند شفقت و مرحمت کے تھے جوڑ کر سفارشی ہوئیں۔ مگر کسی کی ایک نہ چلی۔ اور یہ فاضل حکیم افضل الدین خاقانی شایران کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ دیکھو!! قسمت کا کہا ٹھیک نکلا۔ وہی فردوسی اور محمود کا معاملہ پیش آیا ٭

کئی ماہ قید میں گذر چکے تھے کہ طبیعت سخت گھبرائی۔ اس تنہائی میں اپنی پرانی رفیق شاعری کے سوا کون غمخوار تھا؟ اسی شغل سے طبیعت بہلانی شروع کی۔ چنانچہ تحفۃ العراقین ایک عجیب پر لطف نظم وہیں تصنیف کی۔ اور ایک قصیدہ بھی وہیں لکھا جس سے اُس کی لیاقت علمی اور وسعت معلومات اور قدرت کلام ظاہر ہوتی ہے یعنی اُس میں آتش پرستوں کی اصطلاحات لغات اُن کے حالات وغیرہ نظم کئے ہیں۔ سات مہینے قید میں گذرے تھے۔ اور مثل فردوسی کے اس کا بھی زمانۂ کلفت قریب الاختتام تھا۔ قصیدہ جوں ہی خاقان کبیر کی نظر سے گذرا خیال آیا کہ

رہائی ایسا باکمال اور قید کیا جائے۔ حکم دیا کہ فوراً باکمال شاعر رہا کر دیا جائے۔ خاقانی اس خبر مسرت اثر کو سنتے ہی پھولا نہ سمایا۔ اور رہا ہوتے ہی اللہ تعالےٰ کی عبادت اور ریاضت میں مشغول ہو گیا۔ سوچا کہ خدمت ملوک کا تو نتیجہ دیکھ لیا۔ آؤ اب خدا تعالےٰ کی جو حقیقی شہنشاہ ہے خدمت کریں جس کا نتیجہ عقبےٰ میں کام آئے ٭

زہد و ریاضت زہد و ریاضت میں ایسے کمالات بہم پہنچائے کہ اب شاعری کی صنعت بالکل معدوم ہو گئی اور ولایت اور تقدس کا ضمیمہ مثل نظامی اور رومی کے خیال کیجانے لگی۔ جیسا شاعری میں اپنے کمال کا سکہ قلوب الخلائق پر جمایا تھا ویسا ہی اب اپنی بزرگی کا سکہ جما دیا۔ اور اولیائے کاملین اُسے اولیائے کاملین میں شمار کرنے لگے۔ چنانچہ عارف کامل حضرت عبدالرحمٰن جامی قدس سرہٗ اپنے تذکرہ الاولیا میں اولیا کے زمرے میں خاقانی کو شمار کرتے ہیں اور بڑی تعریف و ثنا کے بعد ایک دو شعر ایسے نقل کرتے ہیں کہ جن سے عشق حقیقی کی بو آتی ہے ٭

حج کے شوق نے مکہ اور مدینہ کی زیارت کرائی موفق التوفیق جمال الدین کے ہمراہی تھے راہ حجاز میں جو اُس نے پرلطف قصیدہ لکھا ہے اُس کا مطلع یہ ہے ؎

سرحد بادیہ است رواں باش برسرش
تریاق روح کن ز نسیم معطرش

ان متبرک مقامات سے فیوضات باطنی حاصل کر کے وطن واپس آیا۔ اور اپنے کمالات ظاہری اور باطنی اور سرمایۂ قصائد و کلام چھوڑ کر۔ اور بقائے دوام کی نعمت لیکر اس فاضل حکیم نے ۵۹۴ھ ہجری کو شہر تبریز میں انتقال کیا اور مقام سرخاب میں مدفون ہوُا۔ اِس کے اِردگرد اور بھی شعرا کی قبریں ہیں۔ منجملہ اُن کے ظہیر فاریابی اور شاہ مسعود وغیرہ کے مزارات باعث رونق ہیں۔ اس لئے اس جوار کو مقبرۃ الشعرا کہتے ہیں ✤

آزاد۔ دہلوی۔ از کلکتہ

زنبیل تاریخی

کارخانہ اخبار نیر اعظم۔ مراد آباد کی طرف سے ہمارے مکرم منشی ایس۔ ابن علی صاحب کے اہتمام سے (جنہوں نے منشی امجد علی صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد کارخانہ اور اخبار کو نہایت خوبی سے سنبھالا ہوا ہے) یہ قیمتی کتاب حال میں شائع ہوئی ہے۔ اسکی ضخامت ساڑھے تین سو صفحہ کی قریب ہے اور اس میں فن تاریخ گوئی کے متعلق نہایت مفید مواد جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔ جس میں تاریخ گوئی کے اصول و قواعد درج ہو چکے ہیں۔ دوسرے حصہ میں جو اب تیار ہوُا ہے کئی لاکھ تاریخی مادے ہیں۔ جو صاحب اس فن کا شوق رکھتے ہیں وہ اسے ضرور دلچسپ پائینگے۔ قیمت حصہ دوم عہ۔ ہے اور قیمت حصہ اول عہ ہے۔ دونوں حصص کو اکٹھا خریدنے والا دونوں عا روپیہ میں لے سکتا ہے ✤

عبرتناک مشاہدہ

بنانے والے نے خون چربی بلغم بال ناخن گوشت پوست اور ہڈیوں سے کیسی کیسی پری وش صورتیں بنائیں اور پھر آپ اُنہیں مٹا بھی دیا۔ جس حکمت کاملہ سے اُن کے بنانے میں سہولیت کا پہلو اختیار کیا اُسی نے ایسی حیرتناک جلدی سے اُنہیں مٹا دیا کہ سب کے سب مُنہ دیکھتے رہ گئے۔ اپنے بھید اُس لازوال قوت نے اپنے ہی تک رکھے۔ اور اپنے کام اپنے ہاتھ کے سوا دوسرے کی طاقت سے باہر۔

جیتی جاگتی مورتیں۔ چلتے پھرتے پُتلے۔ ڈھلتی پھرتی چھاؤں۔ گھٹتے بڑھتے دن رات تو بجائے خود اُس کی معرفت اور قادر یکتا ہونے کے نمونے ہیں ہی۔ مگر مر مٹنے کے بعد۔ خاک ہو جانے پر بھی جو کسی مرنے والے کا کہیں کوئی نشان مل جاتا ہے۔ وہ بھی اُس کی قدرت اُس کی شان اُس کی بے نیازی اور استغنا کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور عبرت کی مجسم تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اُف!

رستہ چلتے میری نظر ایک اُونچی جگہ جا پڑی۔ جہاں اک چھوٹے سے مکان کے پچھواڑے تین کاسۂ سر کوڑی پہ پڑے ہوئے تھے۔ پہلے تو مجھے ذرا یقین نہ آیا کہ اس طرح عین آبادی میں اور ایسے موقع پر جو یوں سرراہ ہو آدمیوں کی کھوپریاں ہونگی۔ مگر نہیں تامل اور غور نے تھوڑی ہی دیر میں فیصلہ کر دیا کہ بیشک جو کچھ میرا خیال تھا سچ مُچ وہی ہے۔ یقین کے بعد میرے قدم وہاں سے نہ بڑھے۔ مَیں نے رومال مُنہ پر رکھ لیا اور ذرا اُونچائی چڑھ کر بالکل اُن کے قریب کھڑا ہُوا۔ اب مَیں کیا بتاؤں۔ مَیں نے کیا دیکھا۔ وہ کھوپریاں زرد ہو گئیں تھیں۔ اُن پر چمڑے کا کہیں نام بھی نہیں تھا وہ گویا ہڈیوں کے خول تھے جن میں آنکھوں کے گڑھے کانوں کے سوراخ جبڑوں کے نشان ناک کا بانسا اور دانتوں کی جڑیں

کم و بیش باقی تھیں۔ مجھے صمّ بکمٌ کھڑا دیکھ کر اور بھی رگیر وہاں ذرا کی ذرا ٹھٹکے۔ ایک نظر اُس منظر کو بھی دیکھا۔ مگر کچھ تو دیکھتے دیکھتے آگے بڑھ گئے۔ کچھ مُنہ پھیر کر آنا کانی دے نکلے۔ دو ایک ناسمجھ مُسکراتے چلدئے لیکن ایک شخص نے بآواز بلند کہا "یہ آدمی کی کھوپریاں یہاں لاکر کس نے ڈالدیں انہیں تو کہیں اور پھینکا ہوتا۔" آہ! آہ! موجودہ حالت اور اِن آخری الفاظ کا اثر جو کچھ اُس وقت میرے دل پر ہُوا وہ لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ قبرستان میں نہیں۔ کسی کھیت میں نہیں۔ جنگل میں نہیں۔ کسی کنوئیں میں نہیں۔ کھائی میں نہیں۔ ہیں تو کہاں کوڑی پر۔ اُس پر بھی انہیں کہیں اور پھینکا ہوتا۔ افسوس! صد افسوس! گو کہنے والے کا مقصد ان الفاظ سے قبرستان ہی کیوں نہ ہو اور مجھے بھی ظنّ المومنین خیرا کے لحاظ سے یہی سمجھنا چاہئے۔ مگر نہیں اُس وقت خود اِن الفاظ نے اور قائل کے نفرت بھرے لہجہ نے یہ معنی ہرگز نہیں ظاہر کئے اور مَیں آسمان۔ زمین۔ اُس مقام اور اُن کاسہ ہائے سر کو ضرور رہ رہ کر دیکھنے لگا۔

ان میں کسی قسم کی حس نہیں تھی۔ کسی جوش کا نام نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ ایک بیکسی نفرت زدہ صورت میں زبان حال سے کہہ رہی تھی کہ "ادھر نہ دیکھو ادھر نہیں دیکھا جاویگا" کاش! مَیں علم اعضائے انسان جانتا ہوتا اور یہ تمیز کر سکتا کہ ان تینوں سروں میں کونسا کس مرتبے کا ہے کون عورت ہے اور کون مرد ہے۔ آخر دیکھتے دیکھتے اُن میں سے دو کو تو مَیں نے اُس نجس اور کثیف جگہ سے اُٹھا کر ایک طرف برابر برابر گردن کے بل رکھ دیا۔ مگر تیسرے سر کے اُٹھانے کی مجھ میں جرأت نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ ایک تو اُن سے زیادہ شکستہ تھا اور دوسرے تھا کچھ ایسی حالت میں کہ مجھ کمبخت سے نہ اُٹھ سکا۔

اِن دونوں میں ایک کا ماتھا کسی قدر چھوٹا اور تنگ تھا دوسرے کا بہت اونچا اور کشادہ تھا جس کا ماتھا اونچا تھا اُس کی ناک کا بانسا بھی سُتواں اور نازک تھا۔ سر بھی دوسرے

سے جس کی گُدی کی ہڈی ایک جگہ سے غیر معمولی اونچی تھی مُدوّر معلوم ہوتا تھا۔ کیا عجب ہے جو یہ مرنے والا پہلے سے زیادہ حسین ہو۔ دُنیوی ثروت میں بھی اُس سے زیادہ ہو۔ کچھ ہو نہ ہو۔ غرض تقدیر میں تو ضرور ایک دوسرے میں تفریق ہو گی۔ اس وقت دونوں کی حالت یکساں سہی۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ دنیا میں بھی دونوں نے ایک ہی حالت میں بسر کی ہو۔ لیکن یہ ہیں کون؟ مسلمان ہیں کہ ہندو؟ عیسائی ہیں کہ یہودی؟ کوئی نہ کوئی مذہب تو ضرور ہو گا۔ آہ! مگر اس وقت تو کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکتا۔ ان میں حاکم و محکوم کا مرتبہ تو نہیں ہے؟ ہو بھی تو کیا عجب ہے؟ لیکن اس وقت تو دونوں برابر ہیں۔ برابر کیا معنی؟ بالکل ایک جگہ ایک مقام پر ایک حال میں۔ پھر کیونکر معلوم ہو کہ یہ کون ہیں؟ مَیں ان سے پوچھوں؟ یہ بولینگے؟ نہیں نہیں یہ بچارے کیا بولینگے۔ اور اگر کچھ کہیں بھی تو مَیں ان کی زبان کیا سمجھ سکتا ہوں۔ نہ سمجھنے کی وجہ؟ وجہ یہ کہ مَیں دوسرے عالم میں ہوں۔ یہ دوسرے عالم میں۔ مَیں بقیدِ حیات ہوں۔ میرا خاکی پُتلا قدرت کے نُور سے ابھی تک روشن ہے اور یہ بچارے دونوں اپنا اپنا وقت ختم کر چکے ان کا نورِ لطیف واپس لے لیا گیا۔ ان کی خاک خاک میں مل گئی اور یہ جو کچھ ہیں بس نہ ہونے کی طرح۔ آپ ہی آپ یہ سوال و جواب کرتے کرتے اور اُن بیجان کھوپریوں کی طرف ٹکٹکی باندھے باندھے ایکا ایکی مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ مرنے والے زندہ ہو گئے۔ اور اپنے بغیر ڈھیلے والی آنکھوں سے برابر مجھے گھور رہے ہیں۔ وہ نگاہیں جو ظاہرا کسی کو نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ بے تحاشا میرے دل میں میرے کلیجے میں اُترتی چلی جاتی تھیں اور مَیں حق حیران کھڑا تھا کہ الٰہی اب کیا ہو گا؟ اُن ہونٹوں میں زبان نہیں تھی۔ اُن پر گوشت پوست نہیں تھا۔ لیکن بے تکلف میرے کانوں میں یہ آواز چلی آتی تھی۔ او دیکھنے والے! کبھی ان آنکھوں میں بھی جادو تھا۔ یہ آنکھیں بھی خوبصورت تھیں۔ مگر اب کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ ہم خود اُن آنکھوں کو جہاں تہاں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ وہ کہاں گئیں۔ یہ کان بھی سخن آشنا تھے کبھی انہوں نے بھی پیار کی باتیں

اتنی سُنی ہیں کہ آخر بہرے ہو گئے۔ اسی صورت کو لوگ دیکھا کرتے تھے مگر اب دیکھا نہیں جاتا۔ انہیں دانتوں نے جن کا نشان ہی نشان باقی ہے وہ وہ لذیذ غذائیں چبائیں اور کھائی ہیں کہ زبان خیال آج تک نہیں بھولتی۔ اے شخص! ہمارے بھی ہاتھ پاؤں تھے۔ کبھی ہم بھی چلتے پھرتے تھے۔ مگر اب اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتے۔ دوسرے کے محتاج ہیں۔ خواہ ٹھوکر مار کر پھینکدے خواہ ہاتھ سے اُٹھا کر کہیں رکھ دے۔ او عارضی نازک دماغ! یہ دماغ اچھا نہیں۔ ناک پر سے رومال ہٹالے۔ کبھی ہم بھی ایسے تھے کہ عطر کی آمیزش ہمیں الگ معلوم ہو جاتی تھی۔ حنا کی تیزی ناگوار۔ چنبا کی شوخی سے دماغ پریشان۔ گلاب سے نزلے کی تحریک کا خوف رہتا تھا۔ اور پھولوں کی پنکھڑیاں کروٹوں میں دب دب کر بنڈے میں نشان ڈال دیا کرتی تھیں۔ لیکن آج وہی ہم ہیں کہ کوڑی اور مزبلہ ہمارا مسکن ہے۔ خس و خاشاک ہماری زینت اور خاک نے ہمارا پردہ ڈھانکنا بھی گوارا نہ کیا۔ او جوان! اپنی صورت پر نہ اِترا۔ اِن اُجلے کپڑوں کو یہاں کی آلائش سے نہ بچا۔ تو ہی دُنیا سے عنقا نہیں۔ ہمارا لباس بھی وہ لباس تھا جس کی ذرا سی شکن درزی کی جان کا وبال۔ اور ہماری بے چینیوں کا پورا ذریعہ ہو جاتی تھی آج وہی ہم ہیں کہ ہمارے مغرور سر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے ہیں اور ہماری چٹکی بھر خاک کہیں ٹھکانے سے نہیں ؎

لحد میں اُن کے جسمِ نازنیں پر کیا گذرتی ہے
سحر تک جن کو بے چینی رہی ہے چین بستر کی

اے بھائی! ہم پر ہنسنا اپنی حالت پر رونا ہے۔ دُنیا میں کسی کو گھڑی بھر چین نہیں۔ یہاں خوشی کا نام بڑی مشکل سے آتا ہے۔ زریں لباس صرف دیکھنے ہی کے ہیں۔ یہاں جواہر پوش مرصع کمر اور قاقم و سنجاب پہننے والوں کے پہلوؤں میں وہ وہ دُکھے ہوئے دل موجود ہیں۔ جو ایک غریب آدمی بھی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اے بھائی! یہاں

جو روتا ہے وہ تو روتا ہی ہے مگر جو ہنستا ہے وہ بھی روتا ہے +

غرور ذلت کی دلیل ہے - بڑے بول کا سر نیچا ہے اِن لفظوں کو ہرگز بے معنی نہ سمجھنا کہیں ایسا نہ ہو یہ سودا سر میں سمائے اور پھر کوئی ٹھوکر بھی نہ مارے ؎

کیا کسی کی ہستیاں ہیں تاج ہو یا دلق ہو
کاسۂ فغفور دیکھا ٹھوکریں کھاتے ہوئے

اے بھائی! جسمانی قوت - رُوحانی طاقت - چند روزہ تحکم یا اس آنے جانے والی جوانی پر بھول کر بھی نہ جانا - بڑے بڑے سورما - بڑے بڑے صاحب اثر - بڑے بڑے کڑیل جوان مائی کے پوت منوں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں آسمان نے انہیں ایسا پیسا کہ سانس لینے کی بھی مُہلت نہ ملی ؎

ہزاروں لالہ رُو ہیں دفن اس میں بھری ہے گو دِ پھولوں سے زمیں کی

یہاں دانائی کا دعوے محض نادانی ہے اور زباں دانی قطعی بے زبانی - اے شخص دُور کیوں جائے ہمیں کو دیکھ لے - ہم اک زمانہ دیکھ چکے ہیں - عمر بھر خاک اُڑائی ہے - اس دنیائے فانی میں کس کس طرح نہیں بسر کر چکے - اپنے وقت میں کیا کچھ نہ جانتے ہونگے لیکن اس وقت ہم تجھے یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ہم کون ہیں - کہاں مرے - کہاں دفن ہوئے - ہڈیاں کہاں پھینکیں اور خاک نامراد کہاں کہاں برباد ہے +

بھائی! دُنیا بالکل سایۂ پرِ کبوتر ہے یہاں کی زندگی بس اُنتے ہی سانسوں کا شمار ہے جو ہنسی خوشی گذر جائیں - نتیجہ سے پہلے کبھی کسی کو خوش نصیب نہ سمجھنا - ٹھیر! ٹھیر! تیری آنکھوں میں ابھی سے کیوں آنسو بھر آئے - لے ایک آخری گیت اور سُن لے - یہ ہمارا گانا نہیں ہے - بلکہ اُن کیڑوں کا گیت ہے - جنہوں نے خاک ہونے سے پہلے ہمیں کھا لیا +

کیڑوں کا گیت

او خاک اِترائے[1] ہوئے! او خاک کی پُتلے!
ہم کو نہ سمجھنا کہ ذرا سے ہیں ذرا سے

ہم وہ ہیں تری قبر سے واقف ہیں گنہگار!
ہم وہ ہیں کہ ہم خاک کی خُشکی سے خبردار

وہ دن بھی تجھے یاد ہیں جب پھیلتا[2] تھا تو؟
وہ پٹتی ہوئی مچھلیاں گدرائے وہ بازو

تن تن کے وہ خلاق کی زمیں پر تراچلنا
اللہ کی مخلوق کو بے خوف کُھندلنا

وہ فتنہ فساد اور وہ ہنگامہ ہستی
وہ جھوٹ دغا شیوۂ صد مکر پرستی

وہ غیر کے ناموس کو دیکھے سے اوچھلتا
وہ دوسروں کا مال زبردستی نگلنا

وہ اپنے پرائے کا ذرا دھیان نہ کرنا
بے شرمیوں پر ہائے وہ تنو جان سے مرنا

وہ آلکسی[3] طاعتِ یزداں میں کہ توبہ
برسوں نہ کیا قبلے کی جانب کبھی سجدا

بیکار پڑے اینڈنا بستر پہ ہمیشہ
کچھ کام کی ہو بات تو سیدم رگ و ریشہ

گردن نہ جھکانا کبھی درماں طلبی میں
سر پھوڑنا دِن رات رہِ بوالہوسی میں

وہ یاد بھی ہے موت کا اندیشۂ باطل
جب آنی ہے آجائیگی کہتا رہا غافل

ناگاہ دُھواں دھار گھٹا چھائی فلک پر
تو جوشِ مسرت میں بڑھا جانبِ ساغر

لیکن وہ گھڑی خونِ تمنا کی گھڑی تھی
اُٹھنے بھی نہ پایا کہ اجل سر پہ کھڑی تھی

سب ٹوٹ گئی دستِ زبردست کی طاقت
کچھ اور بنا دی ملک الموت نے حالت

سکرات کے عالم نے دبا ذائقہ ایسا
رگ رگ یہ پکاری کہ ھنیئاً و مریئاً

دُنیا کے مزوں میں یہی لذت رہی باقی
تاحشر نہ جائیگی کبھی موت کی تلخی

لازم تو نہ تھا کوئی تجھے غُسل بھی دیتا
یا دفن کا ہوتا ترے سامان مُہیّا

لیکن نہیں۔ کچھ خوف خدا آگیا سب کو
میّت کو سرِ شام اُٹھایا کہ نہ شب ہو

---

[1] بدچلن ۔ [2] غرور کرنا ۔ [3] سستی ۔

تجھ پر ہی نہیں حصر، ہے سب کا یہی انجام
زندوں میں بھلا گور کے مُردے کا ہے کیا کام

کیسا ہی جگر بند ہو کیسا ہی ہو دلدار
مُمکن نہیں وہ دن بھی جو رکھ لے کوئی غمخوار

القصہ تجھے لیکے چلے سمت مقابر
پُہنچا دیں تجھے تاکہ کہیں منزل آخر

وہ دو گھڑی رات آئی ہوئی اور وہ بیاباں
بادل وہ گرجتا ہُوا مینہ بوندی کا ساماں

وہ زور ہوا کا کہ چٹختے ہوئے ٹہنے
مینہ برسے تو جل تھل بھریں دریا لگیں بہنے

وہ سلسلہ قبروں کا وہ بجھتی ہوئی مشعل
وہ ہڈیوں کے ڈھیر تو وہ مُردوں کا جنگل

وہ ہول برستا ہوا ظلمات کا پردا
قبروں کے گڑھے تیرہ و تاریک سراپا

پتّوں کے کھڑکنے سے درندوں کا توہم
وہ ساتھیوں کا چار طرف دیکھنا گُم سُم

بجّو کی کہیں تاک تو گیدڑ کا کہیں گشت
سُنسان وہ بستی کہ جہاں چار طرف دشت

سایہ وہ درختوں کا اندھیرے کی وہ چادر
گویا ملک الموت ہی کھولے ہوئے شہپر

تعویذوں کے پتھر نہیں ہر سمت عیاں تھے
قبروں سے یہ نکلے ہوئے مُردے نگراں تھے

کہتا تھا یہ اک قبر سے سرکا ہوا پتھر
پُہنچا ہے بہت دیر میں او بندۂ خودسر

آ جلد کہ آغوش تمنّا ہے کشادہ
اب تک نہیں معلوم تجھے میرا ارادہ

برسوں تو پھرا مجھ سے الگ آنکھ بچائے
کاندھے سے اُتر چھوڑ دے سب اپنے پرائے

آخر تری میّت کو عزیزوں نے اُتارا
اور قبر نے مُنہ کھول کے نگلا تجھے سارا

مٹی دی روانہ ہوئے احباب بچارے
رل مل گئے پھر قبر کے آپس میں کنارے

پڑھوا دئے سب حرف تری لوح جبیں نے
بدلے لئے اک عمر کے آخر کو زمیں نے

پانی کی طرح بہنے لگا گوشت بدن کا
شیرازے کی مانند بکھرنے لگا ڈھانچا

اُس وقت ہمیں خلق کیا جلّ و علا نے
ہم اپنی غذا جان کی تجھ کو لگے کھانے

کچھ دن میں نہ چمڑا تھا نہ بوٹی تھی ذرا بھی
کچھ ہڈیاں کچھ پسلیاں کچھ خاک بھری تھی

}آغا شاعر قزلباش دہلوی

از شاہ علی بندہ - حیدرآباد دکن

تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں

ہمارے مکرم لوی ادریس احمد صاحب بی۔ اے جو محکمۂ وزارت ریاست دام پور میں ہڈ کلرک رہے ہیں۔ اور اب محکمۂ دارالانشا میں ہیں مندرجہ ذیل نتیجہ خیز مضمون عنایت فرماتے ہیں:۔

باخدا لوگوں میں محبتِ خلق موجودات کا باعث مانی جاتی ہے۔ اور خلاصۂ موجودات انسان کی فطرت میں محبت کا غالب مادہ داخل ہونا صریحًا پایا جاتا ہے۔ چونکہ قوانین قدرت بھی بعض اوقات مصلحتًا مستثنیات سے مبرا نہیں پائے جاتے۔ لہٰذا دلِ مردہ سے تو بحث نہیں۔ لیکن بالعموم کوئی "زندہ" دل ایسا نہیں ہو سکتا جس میں محبت کے ولولے جوش نہ مارتے ہوں۔ یہ بے چین رکھنے والے ولولے دل کو ہمیشہ ایک ایسے محبوب کا طالب رکھتے ہیں جس میں اُن ولولوں کے مستقر بننے کی استعداد ہو۔ اور جس کے حصول سے یہ فطری تشنگی بجھ سکے اسی طلب نے طالبین کے گروہ کو دو راستوں پر ڈال کر ایک طرف ارکانِ دنیا یعنی فقرا، زہاد، عباد اور حکما کا مبارک گروہ قائم کیا اور دوسری طرف انتظام جہانبانی کے لئے طبقۂ اہل حکومت و امارت اور سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ جس وجہ سے کہ معمولی بھوکے پیاسے کی بھوک پیاس صرف انواع و اقسام کے لذیذ کھانے پینے کی چیزوں کے ذکر اور فکر سے نہیں بجھ سکتی۔ اُنہیں وجوہ سے پہلے طبقہ کو "تصور شیخ" اور "شیخ پرستی" لازم ہوئی۔ اور دوسرے گروہ کو سالار قوم امیر اور بادشاہ بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ یوں اسباب کے فروعات اور بہت شمار کئے جا سکتے ہیں۔ جو مورخین نے وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ مگر انتخاب کا سبب اُولےٰ یہی سمجھ میں آتا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ کا تذکرہ ہمارا مقصود نہیں۔ بلکہ کچھ "شخصی سلطنت" کا ذکر کرنا مُراد ہے ✤

دُنیا کی بیشمار حکومتوں سے قطع نظر کر کے یورپ کی زبردست سلطنتوں میں برطانیہ کیا بلحاظ قوت و وسعتِ ملک و دولت۔ اور کیا بلحاظِ حسنِ انتظام و وفاداریٔ رعایا بہترین سلطنت تسلیم کی جاتی ہے۔ اس سلطنت نے اپنی طرزِ عمل سے یہ بات ثابت کی ہے کہ جمہوری سلطنت جہانبانی کا ناکافی انتظام ہے اور بغیر ایک ایسے لاشریک وجود کے جسکو باوجود کوئی سماوی برتری (ڈیوائین رائٹ) حاصل نہ ہونے کے رعایا کی حفاظتِ جان و مال کے متعلق خاص خاص حقوق سپُردہ ہوں سلطنت کی چُول ٹھیک نہیں بیٹھ سکتی۔ وجہ یہ کہ مسٹر گلیڈسٹون اور لارڈ سالسبری ایسے اراکینِ سلطنت کی بیدار مغزی اور دانشمندی رعایا کے دل سے "تحسین و آفرین" کے نعرے بلند کرا سکتی ہے۔ مگر رعایا کے دل و دیدہ کی جس تشنگی کو کوئین وکٹوریا اور کنگ ایڈورڈ کا دیدار فرو کر سکتا ہے اُس کرامت سے بڑے سے بڑا اور عقلمند سے عقلمند وزیرِ سلطنت بھی عاری ہے۔ یہ مانا کہ سلطنتِ جمہوری کے فدائی فرقے بھی کونسل اور پارلیمنٹ کے پریسیڈنٹ منتخب کرتے ہیں۔ مگر کیا کوئی آج دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ شاہ ایڈورڈ کی علالت طبع اور بتدریج صحتیابی کی روزانہ خبروں نے بیم و رجا کا جو دلاویز اثر اہل انگلستان اور اہل ہندوستان کے دلوں میں پیدا کیا۔ وہ آمریکہ یا فرانس کے کسی طبقۂ رعایا پر پیدا ہو سکتا ہے؟ کیونکر ہو سکتا ہے؟ پریسیڈنٹ قانوناً خاص مدت کے لئے مُلکی معاملات میں ہمارا رہنما ہوتا ہے اور بادشاہ سے ہم نہ صرف معاملات میں انصاف کے متوقع ہوتے ہیں۔ بلکہ ہر وقت ہر لحظہ اُس کو سرچشمۂ رحم و الطاف محسوس کئے رہتے ہیں۔ اس حیثیت سے ہر شخص اُسے "اپنا" (بادشاہ) سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پبلک جلسوں کے موقعہ پر بادشاہوں کے سواری عام گذرگاہوں میں رعایا کے جمگھٹ میں ہوتی ہوئی نکلتی تھی۔ اُس وقت اُن کی اُٹھی ہوئی آنکھیں اور اُن کی غیر محسوس طور پر چاروں طرف دوڑتی ہوئی نگاہیں زبان حال سے کہا کرتی تھیں "تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں"۔ ہندوستان کی موجودہ گورنمنٹ اور گذشتہ اسلامی

سلطنتوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جو اُولوالعزم سردار ہندوستان کی قدرتی زرخیزی اور آب و ہوا کی تعریف کا شہرہ سُنکر شمال و مغربی دروں سے اپنے گروہ کو لیکر اس سرزمین کے فتح کرنے کے شوق میں آتا تھا وہ یہاں کی سرحد میں قدم رکھتے ہی اپنے وطن اصلی کو اُسی وقت سے خیرباد کہدیتا تھا۔ یہ بہادر لوگ کچھ ایسا شگون لیکر گھر چھوڑتے تھے کہ اُن کو قطع نظر چند خفیف حملوں اور خفیف لڑائیوں کے تخت شاہی تک پہنچنے کے لئے پختہ سڑک تیار ملتی تھی دارالسلطنت میں پہنچتے ہی عنانِ حکومت اُن کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ہندوستان کے دلچسپ مناظر۔ یہاں کی زرخیزی۔ رعیت کی خوشحالی اور اطاعت کا مادہ اُن کے دلوں کو کچھ ایسا لُبھا لیتا تھا کہ پھر اُن کو بھول کر بھی کبھی اپنی غیر آباد اور وحشتناک سرزمین کی یاد نہ آتی تھی۔ اس وجہ سے فاتحین کا تعلق زمین مفتوح سے روز مرہ مستحکم ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کے آخر میں کوئی تمیز باہمی باقی نہ رہتی تھی۔ چنانچہ ہند میں اہل اسلام نے جس رغبت و شوق سے مفتوحین کی راہ و رسم کو اختیار کیا اُس کا نمونہ اس وقت تک مسلمانوں کی طرز معاشرت اور شادی و غمی کی رسوم میں اچھی طرح پایا جاتا ہے۔ چونکہ اُنھوں نے پولیٹکل مصلحتوں سے اپنے قومی جذبات کو بالکل فرو کر دیا تھا۔ اس لئے یہاں کی اقوام کی کسی ادا کو وہ نظر مغائرت سے نہ دیکھتے تھے اور نہ اُن کو اپنی جرأت شجاعت و سلطنت کے موجود ہوتے ہوئے شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ گہرا ریل میل رعیت کی محبت اور جوشِ اطاعت کو ٹھنڈا کر سکتا ہے۔ ہماری برٹش گورنمنٹ کا اول تو جماؤ ہی نرالے طور سے ہوا۔ پھر حکومت ہاتھ آنے پر بھی ہندوستان کو باوجود اس کی وسعت و عظمت کے ایک باجگذار صوبہ قرار دیا۔ غدر کے بعد سے ہندوستان ہمیشہ کے لئے اُس تجلی سے محروم ہو گیا۔ جس کا جلوہ عایا کی باہمی نااتفاقیوں کو جوشِ اطاعت سے بدل دیتا تھا۔ تاجِ سلطنت کی شعاعیں اور بادشاہی چہرہ کے قدرتی انوار جو افق سے افق تک یکساں روشنی بخش ہوا کرتے تھے مغربی بادلوں میں نہاں ہو گئے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دل شکستہ رعایا کے حق میں بادشاہِ

وقت کا دیدار ایک نیا جوش پیدا کر دیتا ہے۔ انگلستان میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ باغیوں کے گروہ کے گروہ جن کی بغاوت کی موج خاص لنڈن میں داخل ہو چکی اور جن کے جوش کے سامنے ملکی فوج جی ہار چکی تھی وہ نوعمر بادشاہ کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر اور صرف یہ لفظ سُنکر کہ میں "تمہارا بادشاہ" ہوں۔ سب کے سب منتشر ہو گئے ہتھیار رکھ دئے اور امان مانگی۔ نپولین اعظم شاہنشاہ فرانس جب کہ فرانس کے جملہ اہالی و موالی سلطنت کی رائے کے مطابق اول مرتبہ جلا وطن کیا گیا تو چند روز کے بعد اُس کی قدرتی اُمنگ نے اُسکی بہادری کو پھر جوش دیا اور یہ خفیہ طور سے ایک کشتی میں چند دوستوں کے ہمراہ فرانس میں چلا آیا خیال کرنا چاہیئے کہ اس اُلوالعزم نے اپنی جان کو کیسے مہلک خطرہ میں ڈال دیا تھا یہ کوئی ملکی جنگ نہ تھی۔ جس میں مارا جانا دائمی شہرت کا باعث ہوتا محض اپنی مستقل امیدوں پر بھروسہ کر کے کشتی سے اُتر پڑا۔ سارا ملک امرا اور وزرا کی اپیچوں کو سُن سُنکر اُس کا دشمن بنا ہوا تھا مگر نتیجہ کیا ہوا۔ نپولین سفر بازگشت میں تن تنہا اُس فوج کے دستوں میں گھس پڑتا تھا۔ جو جا بجا ملک کی نگہبانی پر مامور تھی۔ اور بآواز بلند اپنی صورت دکھاتا ہوا کہتا تھا کہ میں "تمہارا" ہر دلعزیز "بادشاہ" ہوں۔ اس کی آواز اور صورت سامعین کے دلوں پر بجلی کا سا اثر کر جاتی تھی اور وہ فوراً اُس کی اطاعت قبول کر لیتے تھے چنانچہ جس وقت یہ پیرس یعنی فرانس کے دارالسلطنت کے دروازہ پر پہنچا ایک جرار لشکر اس کے ہمراہ ہو چکا تھا۔ اس واقعہ سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ بادشاہ کی موجودگی رعایا کے حق میں ایک ایسا عجیب اور ناقابل بیان اثر رکھتی ہے کہ جس کا بدل نہ قانون ہو سکتا ہے نہ فوج +

یہ مانا کہ انگلستان کے فرمانروا کا ہندوستان میں مقیم ہونا بوجوہات چند در چند ناممکن ہے۔ مگر کیسا بدل کر دینے والا خیال ہے کہ ملکہ معظمہ مرحومہ نے حکومت ہندوستان ہاتھ میں لئے بعد قریب نصف صدی کے سلطنت کی۔ لیکن اس دراز مدت میں نہ قیصرہ اس وسیع ملک اور اہل ملک پر کبھی نگاہ ڈالی اور نہ یہاں کی کثیر التعداد رعایا نے اپنے والی

اور فرمانروا کی کبھی صورت دیکھی۔ محبّت کے لئے موانست لازمی ہے۔ ہندوستانی والدین اور اولاد کے مابین رشتۂ الفت بہ نسبت انگلستانی والدین اور اولاد کے زیادہ مستحکم ہوتا ہے اور عموماً باپ کی بہ نسبت ماں بچہ کو زیادہ کیوں پیار کرتی ہے وہی جواب کہ پاس رہنے کی مدت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ کسی کو اعتبار نہ ہو تو دیسی ریاستوں میں چھوٹے پیمانہ پر ہمارے مافی الضمیر کا نمونہ دیکھ لے۔ ہر ریاست کے فرمانروا پر بعض لوگوں کی قریب قریب ہر روز نظر پڑتی ہے مگر دیکھنے سے جی سیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ تیج تہواروں کے موقع پر سواری کے نکلنے کے وقت خلقت کا جو اژدہام ہوتا ہے اور جو کوششیں اس ایک چہرہ پر نظر ڈالنے کے لئے کی جاتی ہیں وہ اس کا بدیہی ثبوت ہیں۔ بلکہ میرا ذاتی خیال ہے کہ ہندوستانی ریاستوں کی رعایا اپنے اپنے نواب اور راجہ سے اس سے بدرجہا زیادہ محبت اور قدر کرتی ہے جتنی کہ برٹش سلطنت ہند کے اعلےٰ سے اعلےٰ رتبہ والے تنخواہ دار رکن نے ہندوستان میں آکر ہندوستان کے باشندوں سے کبھی حاصل کی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے دل میں برٹش افسروں کی وقعت اور عظمت بہت زیادہ ہے۔ مگر وہ اُن کے قومی کیرکٹر اور ذاتی اخلاق حمیدہ پر مبنی ہے ورنہ بہ حیثیت حکمراں ہونے کے ہم اُن کو "منہ بولے، باپ سے زیادہ نہیں سمجھتے ٭

ادریس احمد۔ از رام پور

خدنگ نظر لکھنؤ کے ماہ مئی کے پرچہ میں پنجاب کے نامور اور مقبول شاعر پروفیسر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے کا فوٹو۔ سوانح عمری۔ اور ممدوح کی ایک پرزور نظم شائع ہوئی ہے۔ سوانح عمری سالۂ مخزن کے ایڈیٹر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ دیگر مضامین اور غزلیات بھی شایقین حضرات اس نمبر کو مع فوٹو صرف چار آنہ قیمت پر منگوا سکتے ہیں بلا فوٹو دو آنہ علاوہ محصول ڈاک ٭

تصویر کے دو رُخ

یوں تو ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں - ایک روشن اور ایک دُھندلا - ایک سفید اور ایک سیاہ - ایک طرف نقش و نگار اور ایک طرف ورق سادہ - ایک رُخ خط و خال کی آرائش سے زیبا اور دوسرا حُسن و خوبی سے مُعرّا - مگر جو دردناک اور تعجب خیز نظارہ اہل ہند کی روزمرّہ زندگی کی تصویر کے دو رُخ دکھاتے ہیں - بہت کم تصویریں دکھا سکتی ہیں - افسوس اس تصویر کی نقل اُتارنے کے لئے جیسے صاحبانِ فن کی ضرورت ہے وہ میسّر نہیں - نقاشِ ازلی نے بھی اسے کھینچکر "دست از قلم کشید" پر عمل کر لیا ہے - اور جب کبھی کسی مُصوّر نے اس کا نقشہ اُتارنے کی کوشش کی ہے - وہ نور اور پر تو دونوں کو یکساں تناسب کے ساتھ دکھانے میں کامیاب نہیں ہُوا - کسی کی تصویر میں نور اچھا جلوہ گر ہے تو پرتو ندارد - اور کسی نقاش کی نظر پرتو پر جا پڑی ہے تو نور نظر سے اوجھل ہو گیا ہے - ہاں چشم بینائے مطالعہ کے لئے نقاشِ ازل کے ہاتھ کی تحریر کے اوراق ہر قت وا ہیں - آنکھ کو چاہیے کہ ذرا کھُل جائے اور تماشا دیکھے ✤

چلئے پہلے کسی دیسی عہدہ دار سرکاری کے مکان کی سیر کریں - ایک بڑی ڈیوڑھی سے گذر کر ایک وسیع صحن میں پہنچتے ہیں - صحن کے عین وسط میں ایک حوض ہے - جو پانی سے لبالب ہے - حوض کے چاروں طرف خوشنما گملے رکھے ہیں - کرسیاں بچھی ہوئی ہیں اور ہمارے معزز عہدہ دار سرکاری جو ایک پُرانی وضع کے بزرگ ہیں - کچہری سے آکر چوغہ وغیرہ اُتار کر ذرا سستا رہے ہیں - فراش پیچھے ایک بڑا دستی پنکھا لئے کھڑا ہے - اور ہمارے معزز دوست پیچوان کی چاندی کی مہتالی منہ میں لئے دھوئیں کے بادل نکال نکال کر اُن کی پیچ در پیچ رفتار کا ایک مست نگاہی کے ساتھ لطف

لے رہے ہیں۔ گویا آرام و آسائش کی مُورت ہیں۔ اگر کوئی اجنبی اتنی ہی کیفیت کو دیکھے تو سمجھے کہ ہندوستان میں لوگ بڑے آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن ذرا گُستاخی سے نگاہِ تصور کو زنانہ کی طرف لے چلیئے اور نقشہ ملاحظہ کیجئے۔ کہ "گھر کے لوگ" کس حالت میں ہیں۔ بیوی صاحبہ ہیں کہ جبیں بہ جبیں ایک چارپائی پر متمکن ہیں چارپائی پر ایک طرف کو ایک پاندان رکھا ہے جس کے باہر تک کتھے اچونے کے دھبے ہیں۔ اُس کے پاس ایک بچے کا ٹوٹا سا کھلونا پڑا ہوا ہے۔ پائنتی کی طرف کچھ ساگ پات دھرے ہیں اور وہ ماما کو پُکار رہی ہیں "اری جلدی کھانے کا فکر کر۔ ابھی میاں آتے ہونگے۔ ذرا دیر ہوگئی تو میری جان کھا جائینگے۔ تیرا کیا جائیگا" اُدھر سے ماما بڑبڑاتی ہوئی آتی ہے: "جب سے اس گھر میں آئے ہیں نہ دن کو چین نہ رات کو آرام۔ سارا دن کام کاج میں کھپ جاتا ہے۔ اور پھر بیوی کو دیکھو تو پیشانی سے بل ہی نہیں اُترتا"۔ اور سامنے آکر پکار کے کہتی ہے۔ "میاں تو آ بھی گئے۔ میں کون سی فارغ بیٹھی رہی کہ اس سے پہلے کچھ فکر کرتی"۔ اتنے میں ایک چھوٹی سی لڑکی باورچی خانہ کی طرف سے راکھ سے کھیلتی ہوئی آجاتی ہے اور اُسے دیکھ کر اُس کی ماں طیش میں آتی ہے "ابھی نگوڑی کو نہلا دھلا کر بھیجا تھا۔ اور ابھی پھر لتھڑی ہوئی آگئی۔ اب کہاں تک کوئی اِن کو صاف رکھے۔ اور وہ آئینگے تو مجھے ڈانٹینگے۔ ذرا آپ ایک دن بھی خبرگیری کرنی پڑے تو حال معلوم ہو"۔ اور لڑکی سے مخاطب ہو کر۔ "اری چڑیل آ تو سہی تجھ سے سمجھونگی۔ اب کے باورچی خانہ میں جانا۔ اگر دوسینا تجھ پر توڑ نہ دیا تو کہنا"۔ یہ گھُرکی سُنتے ہی لڑکی بسورنے لگتی ہے اور اُس حالت میں ماں کے ماتھے پر اور بل پڑتے دیکھ کر پھُوٹ پڑتی ہے اور چلّا چلّا کر رونے لگتی ہے۔ رونے کی آواز مردانہ تک گئی اور ہمارے عہدہ دار صاحب چیخے۔ "یہ کیا غل مچا رکھا ہے۔ جب آؤ۔ اس گھر میں کچھ نہ کچھ شور ہی پاؤ گے۔ جاؤ جمن (نوکر کا نام ہے) ذرا لپک کے ننھی کو لے لینا"۔ جمن آواز دیتا ہے۔ اندر سے آواز آتی ہے

ٹھیرو! ذرا اس کا مُنہ دھولیں"۔ مگر لڑکی بھاگ کر اُسی طرح لتھڑی ہوئی مُحسن کی گود میں آجاتی ہے اور وہ نامعقول بے سوچے سمجھے اُسے میاں کے سامنے لے آتا ہے۔ لڑکی کی صورت دیکھتے ہی جھلاتے ہیں۔ اور غُصہ کے جوش بھرے ہوئے اندر جاتے ہیں۔ "سارے دن بیٹھی ہوئی کرتی کیا رہتی ہو کہ ذرا لڑکی کا بھی دھیان نہیں رکھ سکتیں لڑکے تو اب تمہارے محتاج نہیں۔ اُن کے لئے تو میاں جی نوکر ہے۔ وہی بیچارہ انہیں کپڑے پہنا دے وہی سیر کو لیجائے وہی سبق پڑھا چھوڑے۔ ایک لڑکی ہے۔ اُس کی طرف بھرے گھر میں کوئی توجہ کرنیوالا نہیں"۔ یہ عتاب سُنتے ہی بھلا تاب کسے! بیوی بھی بگڑ کر جلے پھپھولے پھوڑنے لگتی ہے۔ اگلے پچھلے گلے شکوے دفتروں کے دفتر کھل جاتے ہیں۔ اور آخر ایسی تلخی تک نوبت پُہنچتی ہے۔ کہ میاں کھانا کھائے بغیر شام کو پڑ رہتے ہیں۔ اور بیوی الگ مُنہ لپیٹ کر اپنے بڑوں کو کوستی ہے کہ ایسے سخت گیر خاوند سے بیاہ دیا کہ عمر رونے میں کٹ گئی *

اب یہاں زیادہ ٹھیرنے کی ضرورت نہیں۔ انہی کے ہمسایہ میں ایک اور معزز عہدہ دار رہتے ہیں مگر وہ نئے رنگ کے آدمی ہیں۔ ذرا اُن کے ہاں ہوتے چلیں۔ ایک مکلّف نشست ہے۔ جس کے دروازوں پر چلمنیں پڑی ہیں۔ اندر پردے لٹک رہے ہیں۔ کمرہ کی آرائش میں انگریزیت کی صاف جھلک نظر آرہی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مکان کے سجانے کا یہ نقشہ ضرور کہیں سے اُڑایا ہُوا ہے۔ کچھ کُرسیاں قرینے سے دھری ہیں۔ کونے میں ایک میز رکھی ہے۔ جس پر شیشہ۔ کنگھی۔ انگریزی خوشبودار تیل بال سنوارنے کا برُش سب سامان درست ہے۔ وسط میں ایک میز ہے۔ جس پر چند نہایت عمدہ جلدوں کی کتابیں ہیں۔ اُن میں بعض تصویروں کے البم ہیں۔ بعض عمارات اور مشہور مقامات کے نقشے ہیں۔ ایک آدھ دلچسپ ناول ہے۔ ایک کسی مشہور سیّاح کا سفرنامہ ہے۔ غرض ہر چیز سے صاحب خانہ کی تربیت سلیقہ شعاری اور صفائی مذاق کا پتا

چلتا ہے۔ اتنے میں دو صاحب نئی وضع کے لباس میں ملبوس مکرہ میں باتیں کرتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ اُن میں سے ایک تو صاحب خانہ ہیں۔ اور دوسرے اُن کے ایک دوست ہیں۔ جو نئے تعلیم یافتہ ہونے کے علاوہ اصلاحِ مُلک و قوم کی فکر میں اکثر مبتلا رہتے ہیں اور کبھی کبھی اپنی خوش تقریری سے بھی کام لیتے ہیں اور اپنے خیالات کا اثر لوگوں کے دلوں پر ڈالنا چاہتے ہیں۔ ذرا ان کی گفتگو سُن لیجئے:۔

صاحب خانہ:۔ اب کے آپ بہت دنوں میں تشریف لائے۔ آپ کے دیکھنے کو آنکھیں ترس گئیں۔ جب آپ کو دیکھتا ہوں دل خوش ہو جاتا ہے۔ قومی کاموں میں آپ کی طرح دلسوزی کرنے والے ہم لوگوں میں ابھی بہت کم ہیں +

مُصلح:۔ جناب یہ سب آپ کی قدر دانی ہے۔ ورنہ مَیں کیا اور میری خدمات کیا۔ واللہ! اگر آپ جیسے قدر دان نہ ہوں۔ تو اس مُلک میں دم گھُٹ جائے۔ مُلک کے واسطے آپ کوئی کام کیجے۔ اہل مُلک آپ سے بدظن ہو جائینگے۔ اور داد کی بجائے اعتراضوں کی بوچھاڑ کرینگے۔ اب اسی عورتوں کے اصلاح کے مسئلہ کو دیکھئے۔ جس سے مجھے دلچسپی ہے۔ کیسا ضروری معاملہ ہے اور لوگ اس سے کس قدر غافل ہیں اور تو اَور۔ جو نیک صلاح دے اُلٹے اُس کے سر ہوتے ہیں +

صاحب خانہ:۔ واقعی جس استقلال سے آپ ان دقتوں کا مقابلہ کر رہے ہیں آپ ہی کا کام ہے۔ فرمائے اب کچھ عرصہ سے کوئی لکچر آپ نے نہیں دیا +

مصلح:۔ جناب مجمع ہی نہیں ہوتا۔ آپ کا شہر ایسے بے مذاق آدمیوں سے بھرا ہُوا ہے۔ ورنہ بندہ تو ہر وقت حاضر ہے۔ اب پرسوں کے لئے ایک جلسہ قرار پایا ہے۔ اُسی کے اہتمام میں جاتا ہوں۔ اور آپ سے مرخص ہوتا ہوں۔ آپ بھی قدم رنجہ فرمائیے گا +

غرض صاحب خانہ سے وعدہ لیکر وہ تو رخصت ہوئے۔ اور صاحب خانہ اندر تشریف

لے گئے۔ گوش زدہ اثرے دارد۔ ابھی ابھی عورتوں کی اصلاح کا ذکر تھا۔ بیوی سے اُسی کے متعلق گفتگو شروع ہوئی :۔

میاں :۔ مَیں نے کئی دفعہ تم سے کہا ہے کہ ابھی موقعہ ہے۔ کچھ شُدبُد لکھنا پڑھنا سیکھ لو۔ واقعی جب کبھی باہر لکھی پڑھی عورتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ تو مجھے سخت ندامت ہوتی ہے۔ اور مَیں تو اسی خیال سے تعلیم نسواں کی حمایت میں کچھ کہنے سے شرماتا ہوں۔ کہ میرے اپنے گھر میں پڑھی ہوئی بیوی نہیں ✤

بیوی :۔ یہ کیا آپ کو دُھن لگی ہوئی ہے۔ کیا سارے زمانہ کی عورتیں پڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہمارے تو کنبہ بھر میں کبھی لکھنے پڑھنے کا چرچا نہیں ہوا۔ کسی کو بہت خیال ہُوا تو قرآن مجید ناظرے پڑھنا سیکھ لیا۔ کہ چلو ثواب کا کام ہے۔ یہ ایک نئی علت لگی۔ کہ پڑھے بغیر گذارہ ہی نہ ہو ✤

میاں :۔ گذارے کی تو بات ہی الگ ہے۔ اب ہم زندگی بھگت ہی رہے ہیں نہ۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بغیر خواندہ بیوی کے زندگی بے لُطف ہے ✤

بیوی (اچانک بگڑ کر) :۔ تو کوئی خواندہ ڈھونڈی ہوتی۔ میری تو ماں کی آنکھوں پر تمہارے ہاں کی رزق روٹی دیکھ کر پٹی ہی بندھ گئی۔ کہ اُس نے مجھے یہاں جھونکدیا ہر وقت پڑھائی کا طعنہ۔ ہر وقت پڑھنے کا جھگڑا۔ اور کوئی بات ہی نہیں۔ بس یہی ایک چھیڑ ہاتھ لگ گئی۔ اب کوئی اور خواندہ کرلاؤ۔ ہم سے بھی جیسے ہو گا زندگی کاٹ ڈالینگے (اور بلند آواز کرکے) آگ لگی ایسی روٹی کو! چولھے میں جائے ایسا رزق! (رونے کی آواز آنے لگتی ہے) ✤

میاں :۔ بیچارے سلیم الطبع آدمی۔ دم بخود۔ خواہ مخواہ امن خانگی میں خلل اندازی پر پچھتاتے۔ کچھ اپنی تعلیم کو کچھ اپنی قسمت کو کوستے باہر نکل آتے ہیں اور دل ہی دل میں کُڑھتے ہوئے خدا سے شکایت کرتے ہیں۔ کہ یا تو اس ضرورت کا احساس نہ دیا ہوتا۔

یا والدین کے دل میں بھی جن کے ہاتھ میں اولاد کی مناکحت کی باگ ہوتی ہے۔ اس ضرورت کا احساس ڈالدیا ہوتا ۔

ہوش است کہ سرمایۂ دردِ سر است   خرم آنکس کز جہاں بے خبر است
در بیضہ نمے کنند مرغاں فریاد   ہر چند کہ بیضہ از قفس تنگ تر است

اب ذرا قومی مُصلح کا تعاقب کیجئے۔ دوست کی ملاقات سے فارغ ہو کر ایک چھاپہ خانہ میں پہنچے۔ وہاں اسی طرح ناقدردانیٔ زمانہ کے دُکھڑے روئے اور کہا کہ خیر:-

"کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے مے کنم"

بلا سے لوگ نہ مانیں۔ ہم تو اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائینگے۔ ایک اشتہار لکچر کا پرسوں کے لئے چھاپ دیجئے۔ لکچر کا موضوع یہ ہو "عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہیں۔" موضوع کا اظہار کرنے پر دیر تک صاحب مطبع سے اس اصول پر بحث رہی۔ حضرت مُصلح نے بڑے شد و مد سے اس اصول کو ثابت کیا اور کہا کہ مرد عورتوں پر اس ملک میں بڑا ظلم کرتے ہیں اور ان کے حقوق غصب کئے بیٹھے ہیں۔ ان کو خدا کے روبرو جواب دینا ہو گا۔ اس گفتگو سے فارغ ہو کر گھر پہنچے۔ ایک پُرانا سا گھر تھا جس میں کھاٹ کھٹولے تک درست نہیں۔ ایک دالان میں جہاں باوجود شام ہو جانے کے چراغ تک نہیں جلا تھا۔ ایک بیکس سی عورت لیٹی تھی۔ یہ ہمارے لکچرار صاحب کی اہلیہ تھی۔ لکچرار صاحب نے اُسے کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہنے دیا۔ اُس کو پوچھا تک نہیں۔ اور آپ الگ صحن میں ایک ٹوٹی سی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ وہ نیک بخت اُٹھی۔ اور پنکھا لیکر جھلنے لگی۔ وہ گھڑی پنکھا کرتی رہی۔ ہمارے انصاف پسند دوست کے مُنہ سے یہ نہیں نکلا۔ کہ بیٹھ جاؤ۔ نہ کوئی شکریہ کا کلمہ نکلا۔ کچھ دیر کے بعد بغیر کسی خطاب کرنے کے پوچھا "کھانا تیار ہے؟" وہ دوڑی اور کھانا نکال لائی۔

پاس بیٹھ کر کھلانے لگی - جو کچھ پکا تھا - اُس نیک اور ایثار کرنے والی بی بی نے خاوند
کے آگے لا کے رکھ دیا - اور جو کچھ اس نے کھانے کے بعد چھوڑا - اُس سے اپنا
پیٹ بھر لیا - معلوم نہیں ہمارے بکچرار کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال
آیا یا نہیں - کہ اُن کے گھر میں زن و مرد کے حقوق کی مساوات کہاں تک ملحوظ ہے
لیکن اگر آیا بھی ہوگا تو اُنہوں نے یہ من سمجھوتہ کر لیا ہوگا - کہ اگر عورت بھی پڑھی لکھی ہو
تو اُس کے حقوق اُن کے ساتھ برابر ہوں *

چلئے ان کے حال سے درگذر کر کے ان کے ایک پڑوسی بابو صاحب ہیں - اُن
کی خانہ داری کا اندازہ کرتے چلیں - بابو صاحب کہیں باہر گئے ہیں - اُن کی غیر حاضری
میں بام خانہ پر ایک عورت چھڑکاؤ کر رہی ہے - ایک چار پائی پر بچھونا بچھا ہے اُسکی
پاس اسی عورت نے حقہ بھر کر رکھ دیا ہے - اُس عورت کی پوشاک یہ ہے - کہ ایک
میلا سا کپڑا ہے - جسے سر سے پانوں تک ساڑھی کے طور پر اوڑھے ہوئے ہے - مگر
وہ ستر میں کچھ بہت مدد نہیں دیتا - شاید خیال گزرے کہ یہ کوئی خادمہ ہے - مگر
نہیں - یہ بابو صاحب کی بیوی ہے - جو آپ تو روز دُھلے ہوئے کپڑے بدلتے ہیں اُن
اور ہم چشموں میں خوش خور اور خوش پوش مشہور ہیں - یہ بھی اچھے اچھے کپڑے رکھتی
ہے - جن کی زرق برق سے آنکھیں چکا چوند ہو جائیں - مگر وہ تو تیوہار یا میلے پر جاتے
یا شادی بیاہ میں شریک ہونے کے موقعوں پر نکالے جانے کے لئے صندوقوں میں
احتیاط سے بند ہیں - اس کے علاوہ اس کے پاس بھاری بھاری زیورات ہیں
جن پر اسے ناز ہے - مگر اُن کو بھی خاص موقعوں پر ہی نکالتی ہے *

اسی مکان کے سامنے جلاہوں کا ایک گھر ہے - اُس میں ایک بڈھا دیرینہ سال
جلاہا بیٹھا حقہ پی رہا ہے - آؤ آج کے مشاہدات کے ختم کرنے سے پہلے اسکی باتیں
سُن لیں - ویسے تو آپ جس دن آئینگے اور جتنی مرتبہ آئینگے ہندوستان کی زندگی کی

تصویر کے دونوں رُخوں کا منظر آپ کو نئے سے نئے رنگ دکھائیگا۔ یہ بڑے میاں گزشتہ زمانہ کی خوبیوں کا بیان کر رہے ہیں :-

آپ :- کہو بڑے میاں آج کل کے زمانے کے بڑے شاکی معلوم ہوتے ہو ٭

بڈھا :- کچھ پوچھئے نہیں - زمانہ کہے سے ایسا نکل گیا ہے کہ کوئی حد نہیں - خدا جانے کیا اندھیر ہونیوالا ہے - عورتوں کی کبھی ایسی آزادی نہ دیکھی نہ سُنی یقین جانئے عمرے کی ماں کو (بیٹے کا نام ہے) مَیں نے وہ وہ پٹیا ہے - مگر بیچاری نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مَیں تمہارے گھر نہیں رہتی - مگر اس عمرے نالائق نے میرے گھر کا ستیاناس کر دیا ہے اپنی عورت کو اس قدر سر چڑھا رکھا ہے کہ خدا کی پناہ - ہمارا بھی جوانی میں بیاہ ہُوا تھا - ہم تو اپنے باپ کے سامنے عورت کی اتنی پاسداری نہیں کرتے تھے - خواہ وہ اُسے جھڑک دیں - خواہ زیادہ کام لیں خواہ کم - خواہ تھوڑا کھانے کو دیں خواہ بہت - یہ ناہنجار تو جس دن سے بیاہا گیا ہے مجھے باپ ہی نہیں سمجھتا - اور وہ نامراد ناشاد ساس سے یوں لڑتی ہے جیسے سوت ہو مَیں نے بارہا لڑکے کو سمجھایا تو آج آخر اُس نے ذرا ہاتھ اُٹھایا تھا - مگر صاحب وہ بگڑی ہوئی عورت ابھی دو چار ہی پڑی تھیں - کہ محلہ سر پر اُٹھا لیا - اور اُس وقت سے رو رہی ہے - کہ میں تو طلاق ہی لونگی - عجب مصیبت میں جان ہے - اُدھر یہ بے عقل پھر موم ہُوا جاتا ہے - کہتا ہے عورت ہاتھ سے جائیگی - حالانکہ مَیں اسے کہہ چکا ہوں - کہ عورت کو تو جوتی برابر سمجھنا چاہئے - ایک اُتر گئی - دوسری پہن لی ٭

بڑے میاں کے خیالات کا نمونہ تو آپ نے سن لیا - چلو اب چل کے سو رہو - خدا کرے خواب میں آپ کو تصویر کا سیاہ رُخ کسی قدر سفیدی سے بدلتا نظر آئے - تو صبح کو ہم آپ کو کوئی اچھی سی تعبیر بتائیں ٭

ایڈیٹر

طاقتِ خموشی

ہمارے عنایت فرما منشی رام رچھپال سنگھ صاحب شیدا دہلوی جن کی نسبت ایک عرصہ سے مخزن کو شکایت تھی۔ کہ باوجودیکہ اُن سے بہت توقع امداد قلمی تھی۔ مگر انہوں نے ایفائے وعدہ نہیں کیا۔ اب ایفائے وعدہ فرما کر ہمیں ممنون فرماتے ہیں۔ اُن کا مضمون تشکر یہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

انسان کے مشاہدہ اور تجربہ میں آیا ہے کہ زبردست آواز زبردست طاقت بے تغیب نہیں ہوتی۔ بادلوں کی کڑک۔ توپوں کی دھمک سے دل سینوں میں ہل جاتے ہیں ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔ شیروں کی دھاڑ سے لوگ دہل جاتے ہیں۔ انجن کی بھک بھک اور ریل گاڑیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے سٹیم کی زبردست طاقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے آندھیوں کے زور اور دریاؤں کے شور عناصر باد و آب کی طاقت کے مظہر ہیں لیکن بیشمار طاقتیں ایسی موجود ہیں جن میں آواز نہیں ہے۔ مگر اُن کی عظمت اور اُن وجود سے کوئی انکار نہ کر سکیگا ✤

کائنات کی سب سے بڑی طاقت کشش ثقل جس کی وجہ سے اجرام فلکیہ اور اُن نظام قایم ہیں۔ کیسے چپکے چپکے اپنا کام کر رہی ہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ ہر ایک چھوٹی بڑی چیز اُس کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے ✤

قوت برقی اور قوت مقناطیسی بغیر کسی شور و غل کے اپنا کرشمہ دکھاتی ہیں۔ ان کو بھ جانے دو۔ تمام قوتوں کے مالک اور تمام طاقتوں کے خالق حضرت باری عزّ اسمہٗ کس خاموشی سے کوس لمن الملکی بجا رہے ہیں اور کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں کہ کسی مجال قیل و قال نہیں ✤

آخر اس میں کیا بھید ہے کہ ہر ایک بڑا کام چپ چاپ ہوتا ہے چوروں اور راہزن

ے مشورے۔ انقلاب پسند مدبروں کے جلسے۔ پیروں مریدوں کے حلقے۔ تمام بڑی بڑی سازشیں۔ شب بیداروں کی عبادتیں عشق وحسن کی گھاتیں۔ رازونیاز کی باتیں۔ سب چُپکے چُپکے ہوتی ہیں۔ اگر خموشی مشکل کشا نہ ہوتی تو کیوں ہر ایک مقصد کے لئے اس کا سہارا ڈھونڈا جاتا ✤

خاموشی اور تنہائی فلاسفروں اور شاعروں کی ہمراز۔ موجدوں اور مصنفوں کی دمساز ہے۔ پس اگر یوں کہیں کہ جس قدر دُنیا میں علم و ہنر کی روشنی۔ ایجاد و اختراع کی برکت ہے، سب خموشی کی بدولت ہے تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا ✤

اے ہومر اور شیکسپیئر۔ بائرن اور ملٹن کو زندہ جاوید کرنے والی۔ سعدی اور حافظ۔ خاقانی اور انوری کو بقائے دوام بخشنے والی۔ کالیداس اور والمیک کو حیاتِ ابدی کا جام پلانے والی۔ خاموشی! سٹیفن اور روبنسن تیرے ایسے ہی ممنون ہیں جیسے ایڈیسن اور مارکونی۔ سقراط اور ارسطو تیرے ایسے ہی گرویدہ ہیں جیسے کہ مِل اور سپنسر ✤ شاعر ہو یا فلاسفر، ناول نویس ہو یا ایڈیٹر، تیرے بغیر ہیچکارہ ہے۔ تیرے ہی دم سے بزم جہاں کی رونق ہے۔ ہر طرف تیری ہی چہل پہل ہے ✤

مرزا دبیر ممبر پر رونق افروز ہیں۔ مجلس میں تل رکھنے کو جگہ نہیں۔ چار طرف شور وغل ہے۔ مگر ایک رباعی کا مصرع شروع کرتے ہی سناٹا ہو جاتا ہے۔ ع
"شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں" ✤

حضرات!

شیرانِ مضامیں کو کہاں بند کروں بھر نکلے ڈکار بنگے جہاں بند کروں
خلاقی مضموں کا ہے سب کو دعوائے کھل جائے جو چند سے میں زباں بند کروں

لیکن اگر غور کریں کہ یہ شیرانِ مضامین کس جنگل سے نکلے ہیں تو معلوم ہوگا کہ گوشۂ تنہائی سے مرزا صاحب کے میدانِ خیال میں چھلانگے مارتے آتے ہیں۔ رات کو مرثیہ کے بند

لکھتے لکھتے دوچار رباعیاں بھی لکھ ڈالیں ۔

آنریبل سرینڈر ناتھ بنرجی ٹون ہال کلکتہ میں میونسپل بل پر تقریر کر رہے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا دریا اُمنڈ رہا ہے ایک ایک فقرہ پر سامعین کا جوش بڑھتا جاتا ہے جو لفظ ہے فقرہ میں نگینہ کی طرح جڑا ہوا۔ آتش بیانی دلوں میں آگ لگا رہی ہے۔ سحر بیانی غضب ڈھا رہی ہے۔ ایسی تاثیر دیکھی نہ سُنی۔ مگر یہ کیا ہے۔ مسٹر بنرجی رات کو دو گھنٹہ تک اس مضمون پر تنہائی میں سوچتے رہے ہیں۔ بلکہ گرما گرم فقروں کی بندش بھی پہلے سے درست کر رکھی ہے۔ ہر شخص مرزا دبیر کے کلام سحر نظام پر لٹّو ہے اور مسٹر بنیرجی کی لسانی کا معتقد لیکن مَیں اُس وقتِ فرصت کا گُن گاتا ہوں۔ مَیں اُس گوشۂ تنہائی اور سنّاٹے کا مداح ہوں جو اُن کی شہرت اور ناموری کا اصلی منبع ہے ؎

من از آتش دُخاں بینم تو آتش از دُخاں بینی

معترض کہینگے کہ صاحب کسب یا وہب آخر کوئی چیز ہی نہیں۔ جب قابلیت ہی نہ ہو تو خاموشی یا تنہائی کیا بنالیگی۔ لیکن بندہ نواز قابلیت تب ہی پیدا ہوتی ہے۔ جب یکسوئی حاصل ہو۔ کسی کام میں خیالات کو جمع کر کے مصروف ہو جاؤ تم اس کے مالک ہو۔ اس میں خواہ تحصیل علم ہو یا کسب فن۔ لیکن یکسوئی کے لئے تنہائی شرط ہے۔ اور تنہائی ایسی کہ خیالات منتشر نہ ہوں۔ تنہائی میں تنہا ہونا مشکل ہے۔ خاموشی میں بھی چُپ رہنا دشوار ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جب انسان کسی کام کی دُھن میں ایسا مصروف ہوتا ہے کہ اپنی ہستی کا بھی علم نہیں رہتا تب شاہدِ مقصود سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ یہی کامیابی کا رستہ ہے۔ جس کا دل چاہے دولتِ دارین گوشۂ تنہائی سے لوٹ لے ۔

موت کی فتحمندی سے کون بے خبر ہے۔ جس نے اوتاروں۔ پیغمبروں۔ اولیاء
اور اقطاب کو بھی ملک خموشاں ہیں داخل کئے بغیر نہ چھوڑا۔ خدا کے منکر لاکھوں ہیں لیکن
ملحد سے ملحد تک اُس یقینی طاقت کے وجود سے انکار نہیں کرتا جس کے زبردست
ہاتھ سے ہر فرد مخلوق کو جامِ کل من علیہا فان پینا ہو گا۔ لیکن موت کیا ہے؟ ایک حالتِ خاموشی
ہے جو ظہور اور عدم کے مابین حائل ہے۔ ایسی خاموشی کہ جس کے عائد ہونے پر قیامت تک
بولنا نصیب نہ ہو گا؟۔

کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

اے شہرِ خموشاں کے رہنے والو! ہمارے اور تمہارے درمیان صرف موت کا پردہ
حائل ہے جو ایک روز یقیناً ہر شخص کے لئے اُٹھایا جائیگا۔ اور پھر ہم بھی تمہاری عظیم الشان
آبادی کا نظارہ دیکھ سکینگے۔ ہماری اور تمہاری بستیوں میں قطرہ اور سمندر کی نسبت ہے۔
اگرچہ موت نے مُہرِ خموشی تمہارے لبوں پر لگا دی ہے۔ لیکن تم میں سے اکثر زندۂ جاوید
بدستور ہماری عقلی۔ اخلاقی۔ روحانی طاقتوں کو اُبھارتے ہیں۔ زمانہ کے نشیب و فراز
سے آگاہ کرتے اور گمراہوں کو رستہ بتاتے ہیں۔ تمہارے فیضِ صحبت کا دریا جبتک
زمین و آسمان قائم ہیں جاری رہیگا۔ تم میں آواز نہیں ہے تو کیا یہ معجزہ نہیں۔ کہ تم
لائبریری کے سنسان گوشہ میں اپنی داستان مجھے سُناتے اور دل بہلاتے ہو۔ قسم ہے
پروردگار کی جو لطف تمہاری صحبت میں ملتا ہے وہ ہماری دنیا کے اکثر لوگوں کی صحبت
میں نہیں جو صرف کہنے کو زندہ ہیں +

شیدا۔ دہلوی

آفتاب

ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں یہ دُعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا اُن تاثرات کا اظہار ہے جنہوں نے نظامِ عالم کے حیرتناک مظاہر کے مشاہدہ سے اول اول انسانِ ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا اس قسم کی قدیم تحریروں کا مطالعہ علم ملل و نحل کے عالموں کے لئے انتہا درجہ کا ضروری ہے۔ کیونکہ ان سے انسان کے روحانی نمو کی ابتدائی مراحل کا پتہ چلتا ہے۔ یہی وہ دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اور جس کو برہمن اس قدر مقدس سمجھتا ہے کہ بے طہارت اور کسی کے سامنے اس کو پڑھتا تک نہیں۔ جو لوگ محققین السنۂ شرقیہ کی تصانیف سے واقف ہیں اُن کو معلوم ہے کہ سر ولیم جونس مرحوم کو اس دعا کے معلوم کرنے میں کس قدر تکلیف اور محنت برداشت کرنی پڑی تھی۔ مغربی زبانوں میں اس کے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔ اس مقام پر یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصل سنسکرت میں لفظ سِوِتُر استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے اردو لفظ نہ ملسکنے کے باعث ہم نے لفظ آفتاب رکھا ہے لیکن اصل میں اس لفظ سے مراد اُس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے یہ مادی آفتاب کسبِ ضیا کرتا ہے۔ اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیا نے اللہ تعالےٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے "اللہ نور السمٰوات والارض" اور شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالےٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا۔ علےٰ ہذا القیاس افلاطونِ الٰہی کے مصری پیروؤں اور ایران کے قدیم انبیا کا بھی یہی مذہب تھا +

ترجمہ کی مشکلات سے ہر شخص واقف ہے لیکن اس خاص صورت میں یہ دقت اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ اصل الفاظ کی آواز موسیقیت اور روحانیت آمیز اثر جو ان کے پڑھنے سے دل پر ہوتا ہے اردو زبان میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ گایتری کے مصنف نے ملک الشعراء تینی سن مرحوم کی طرح اپنے اشعار میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جن میں حروف علت اور صحیح کی قدرتی ترتیب سے ایک ایسی لطیف موسیقیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا غیر زبان میں منتقل کرنا

ناممکنات میں سے ہے۔ اسی مجبوری کی وجہ سے مَیں نے اپنے ترجمہ کی بنیاد اس سوکت (گفتار زیبا) پر رکھی ہے جس کو سربا نرائن اپنشد میں گایتری مذکور کی شرح کے طور پر لکھا گیا ہے ترجمہ کرنے کو تو مَیں نے کر دیا ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ سنسکرت داں اصحاب اس پر وہی رائے قایم کرینگے جو جیپ سن نے پوپ کا ترجمۂ ہومر پڑھ کر قائم کی تھی یعنی شعر تو خاصے ہیں۔ لیکن یہ گایتری نہیں ہے + محمد اقبال

اے آفتاب روح و روانِ جہاں ہے تو ! شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو !
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا ! ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا !
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے ! ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے !
ہر شے کو تیری جلوہ گری سے ثبات ہے ! تیری نگاہ رشتۂ تارِ حیات ہے !
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے ! دل ہے خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے !
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو ! یزدانِ[1] ساکنانِ نشیب و فراز تو !
تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں ! تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں !
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو ! زائیدگانِ[2] نور کا ہے تاجدار تو !

نے ابتدا کوئی نہ کوئی انتہا تری !
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری !

[1] یزدان کو قدیم حکمائے ایران اصلِ نور تصور کرتے ہیں۔ اس واسطے خالق کی جگہ یہ لفظ استعمال کیا گیا +

[2] یعنی دیوتے۔ سنسکرت میں لفظ دیوتا کے معنی زائیدۂ نور کے ہیں یعنی ایسی ہستی جس کی پیدائش نور سے ہوئی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندو دیوتاؤں کو دیگر مخلوقات کی طرح مخلوق تصور کرتے تھے۔ ازلی نہیں سمجھتے تھے۔ غالباً اُن کا مفہوم وہی ہو گا جس کو ہم لفظِ فرشتہ سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ فرشتوں کا وجود بھی نوری تسلیم کیا گیا ہے اگرچہ ان کو مخلوق مانا گیا ہے۔ پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گرداننا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا + اقبال

مذہب اور سائنس

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

جب کیا سائنس نے ختم اس طرح اپنا خطاب　　ہنس کے مذہب نے دیا پھر یوں جوابِ باصواب
اس قدر شوخی و گستاخی بزرگوں کے حضور　　خود سمجھ کا ہے تری اے طفلکِ ناداں قصور
اپنی حالت کی اگر ہوتی تجھے کچھ بھی خبر　　تو کہاں پیدا ہوا اور پرورش پائی کدھر
جانتا گر تو کہ تیری سرپرستی کس نے کی　　نام سے بھی جن دنوں واقف نہ تھا تیرے کوئی
آج میرے سامنے اس طرح اِتراتا نہ تو　　یوں نہ شوخی اور گستاخی سے کرتا گفتگو
کچھ بڑے ہو کر بڑوں کے نام سے بیزار ہیں　　اس زمانہ کے بھی لڑکے کیا ہی ناہنجار ہیں
خالقِ اکبر نے جب انسان کو پیدا کیا　　اُس کی صورت اور سیرت تجھ کو بتلادوں [illegible]
تھا بہائم کی طرح ننگا وہ از سر تا بہ پا　　مثلِ درندوں کے وہ بیباک اور خونخوار تھا
نفع و نقصاں کی اُسے اک شمہ بھی پروا نہ تھی　　تھا تو انساں پر تمیزِ نیک و بد اصلا نہ تھی
تھی اوامر اور نواہی کی نہ اُس کو کچھ خبر　　ماں سے بیٹا بے خبر تھا اور دختر سے پدر
قاعدہ کوئی نہ تھا اُس وقت اس کا رہنما　　کوئی قانوں اُس کے قول و فعل پر حاوی نہ تھا
تھا نہ تہذیب و تمدن کا زمیں پر کچھ نشاں　　تھا نہ دُنیا میں ترقی کا کوئی وہم و گماں
علم و فن کو کب کوئی پہچانتا تھا اُن دنوں　　نام تک تیرا نہ کوئی جانتا تھا اُن دنوں
جب کہ تاریکی میں یکساں ہو رہے تھے باغ و راغ　　بر سرِ راہ میں نے ہی رکھا شریعت[1] کا چراغ
میں نے ہی انسان پر ظاہر کیا نامِ خدا　　حق و ناحق کا اُسے میں نے ہی بتلایا پتا

[1] ہر ایک مذہب کی شریعت مُراد ہے ؎

ایک ہی تھا مَیں ازل سے اور ابد تک ایک ہوں
اختلافِ باہمی ہے صرف انساں کا جنوں

نوح و ابراہیم و موسیٰ عیسیٰ و ختمِ رسل
تھے اصولوں میں پر افسردہ اک کالج کے کل

ہے نہیں تورات اور قرآں میں چنداں اختلاف
زند و اوستا و بید اور انجیل متوارد ہیں صاف

اختلافِ رائے کا تحریف یا تاویل کا
یا مرے احکام میں تکثیر یا تقلیل کا

فلسفی کی دانش اور ناداں کی اُلٹے فہم کا
یا کسی کی اپنی ایجاد اور گھڑت یا وہم کا

ضامنوں اور وعدہ داروں میں مجھ کو کرنا شمار
گر یہی انصاف ہے تو مَیں نے بھر پائے ہزار

مَیں جیالوجی[1] پڑھانے کو نہیں آتا ہوں یہاں
میرے مکتب میں نہیں علمِ طبیعی کا نشاں

ہسٹری جغرافیہ میرے سکولوں میں نہیں
ہندسہ اور ہیئت اپنے گرکلوں[2] میں نہیں

غیب اور لاہوت میرے مدرسہ کا ہے نصاب
ہے بس اک اخلاق اور روحانیت کی یہاں کتاب

گر کوئی علمی اشارہ ہو میری تحریر میں
یا ہو گر مذکور تاریخی میری تقریر میں

مدعا اُس کا نہیں ہے دنیوی علم و ہُنر
محض روحانی مقاصد ہیں میرے مدِنظر

صاف و سادہ ہے سلیس اور عام فہم اپنا کلام
مُستفید اس سے ہوں نادان اور دانا تمام

اُلفتِ ہمسایہ و ہمدردیٔ باہم دگر
نقش مَیں نے ہی کئے لوحِ دلِ انساں پر

گر کوئی دے چپڑ لگا وے تیری دائیں گال پہ
حکم[3] تھا میرا کہ تو بایاں بھی اُس کے پیش کر

پر نہ جب نچلا رہے اُس کے تو لئے انتقام
مَیں نے ہی جاری کیا لاتعتدوا[4] کا حکم عام

مَیں نے انساں کو معیشت کا سبق پہلے دیا
بابِ آدابِ تمدن مَیں نے ہی یہاں وا کیا

حفظِ صحت کے اصول اُس کو سکھائے میں نے ہی
آدمیت کے حقوق اُس کو بتائے مَیں نے ہی

مَیں نے ہی اعمالِ حسنہ کی اُسے ترغیب دی
مَیں نے ہی فعلِ شنیعہ سے اُسے ترہیب کی

مَیں نے ہی اس جد و جہد و سعی سے کر کے تیار
ابنِ آدم کو کیا علم و ہُنر کا خواستگار

مَیں نے ہی انساں کو تاکید سے یوں کہہ دیا
چین تک بھی جستجو علم و ہُنر کی ہے روا۔

۱ علم طبقات الارض ۲ بمعنی نصاب ۳ حکم انجیل مقدس ۴ حکم قرآن مجید

سوچ برخوردار ناداں اپنے دل میں تو ذرا — میں ترا دشمن رہا ہوں یا کہ تیرا قبلہ گا
پیشوایانِ مذاہب کے مصائب کا گلا — مجھ سے اے الٹی سمجھ والے ہے خود تیری خط
ملک گیری کی ہوس پر بادشاہوں فساد — یار لوگوں نے بتائے مذہبی جنگ اور جہا
باوجود اس کے کہ تو نے بال کی کھینچی ہے کھال — تیری تحقیقات کا گو روز افزوں ہے کمال
پر تجھے معلوم کرنے کی یہ طاقت ہی کہاں — دہر و نیچر[1] کی کلوں کو کون رکھتا ہے رواں
تو عناصر کی حقیقت کا ابھی ماہر نہیں — باعثِ ایجاد و تکوین تجھ پہ کچھ ظاہر نہیں
تجھ کو تشریحات میں حاصل ہے گو دستِ رسا — روح کا اب تک لگا سکتا نہیں کچھ تو پتا
گرچہ لاثانی ہوا جفار اور رمال تو — عاقبت کا پر بتا سکتا نہیں کچھ حال تو
ہے سمجھ تیری سے بالا میری یونیورسٹی — دخل ہے جس میں نہ ناسوت و شہادت کا کوئی
خلق حسنہ کا سبق تیری کتابوں میں نہیں — عمل صالح تیرے کالج کے نصابوں میں نہیں
غور سے دیکھا نہ پایا پر مضامیں کو ترے — کچھ تعلق رحم سے یا عدل اور انصاف سے
قادرِ مطلق کی قدرت ہے ہیچوں میں دخیل — گر ہوا کچھ تو تو فتوے ہے مرا الا قلیل
اس تگ و دو میں کروڑوں سال گر گذریں تجھے — حد و پایاں تو نہ علمِ غیب کا کچھ پا سکے

سراج الدین احمد

آیا بنائے ہستیٔ انساں میں جب خلل — رونا ہے بے حصول کہ ہے سعی بے محل
جاتا ہے کوئی آج جہاں سے تو کوئی کل — روؤ کہ خاک اڑاؤ نہیں چھوڑتی اجل

انیس

---

[1] دہر و نیچر کے حکموں کے رواں رکھنے والے کی بابت کوئی نہیں بتلا سکتا ۔

دُنیا کی بے ثباتی سے سبق

مندرجہ ذیل نظم ہمارے مکرم جناب پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ متخلص بہ کیفی تلمیذ مولنا حالی مدظلہ کی طبعِ رواں کا نتیجہ ہے۔ یہ ایک عرصہ سے ہمارے ذخیرہ میں پڑی تھی۔ آج ہدیۂ ناظرین ہوتی ہے۔ ہم پنڈت صاحب سے معافی چاہتے ہیں کہ اس کے شائع ہونے کی نوبت اس قدر دیر میں آئی :-

گلہ کرتا ہے کیا ناداں دورِ آسمانی کا — ہے شکوہ سر بسر بیجا جفا ہائے جہانی کا
غنیمت جان جو دم شکر و اطمینان میں کٹ جائے — بھروسا کیا ہے ہمدم اس دو روزہ زندگانی کا
دغا اس بیتِ فرتوت نے دی ہے زمانہ میں نہ کس کس کو — ہے ذرہ ذرہ شاہد اس کے جور و ظلم رانی کا

وہ کیواں بارگاہوں کے مکیں کیا ہو گئے کہیئے — کہ لکھتے ہیں لقب جن کے لئے جنت مکانی کا
کہاں وہ نائبِ ذاتِ خدا ہیں صاحبِ کشور — کہ تھا گردوں سے بالا پایہ جنکی راجدھانی کا
تھے چاروں کھونٹ میں جھنڈے گڑے جنکی حکومت کے — پڑا تھا شش جہت میں شور جنکی کامرانی کا
نشاں نسلوں کا اُن کی ہو گیا مفقود عالم سے — ہے باقی نام ہی جشنِ جم و نوشیروانی کا
کہاں ہے وہ شہِ شاہانِ ہفت اقلیم اسکندر — شہِ خاور تھا اک چاؤش جس کی حکمرانی کا
کہاں زابلستانی ہیں کہاں عباسی و طوسی — پتا بتلائے تو کوئی خجسندی کیانی کا
نشاں رومائیوں ساسانیوں کا کوئی بتلاؤ — بتاؤ غزنوی کا کچھ پتا اور سیستانی کا
نہ غوری ہیں نہ چغتائی۔ نہ خلجی اور نہ تغلق ہیں — پتا ملتا ہے تو بس مقبروں ہی گورگانی کا
کہاں ہیں چندر بنسی اور سورج بنسی وہ راجے — کہ مہر و ماہ پر سکہ تھا جن کی حکمرانی کا
قلم و قطب سے تا قطب تھی پھیلی ہوئی جن کی — نہیں ملتا ہے اب پتھر بھی ایسوں کی نشانی کا

ہوئے کیوں ہمتھ کو ساتھ اُن کے دعوے سربسر جھوٹے　　کہ لوہا مانتا تھا دہر جن کی تیغ رانی کا
اگر باقی ہے تو بس نام ہی اک رہگیا باقی　　فلاں بیکنٹھ باسی۔ اور فلاں عرش آشیانی کا

نہ وہ عالم نہ وہ فاضل نہ وہ شاعر ہی باقی ہیں　　کہ جن کو زعم تھا اسرارِ حق کی رازدانی کا
کہاں علم و حقایق کے وہ ماہر اور کامل ہیں　　کہ اک اک جن میں تھا غواص دریائے معانی کا
زباں تھی جنکی یا گنگا رواں تھی ایک جنت سی　　سخن تھا جن کا اک چشمہ حیاتِ جاودانی کا
نہ اب تک جن کے علم و فضل کی کچھ تھاہ ملتی ہے　　کہ تھا ایک ایک جن میں اک سمندر نکتہ دانی کا

کہاں ہیں وہ حسیں نوبادۂ فردوسِ محبوبی　　گماں بھی تھا نہ جن کو لطمۂ بادِ خزانی کا
صفا تھی جن کے عارض کی صفائے دل کا آئینہ　　تعلق قلب سے تھا جن کے اقرارِ زبانی کا
دہن ایسے کہ جب اُن کی نہ پوری کھچ سکی صورت　　ذرا سا رہگیا خفت سے مُنہ بہزاد و مانی کا
غضب کا کاٹ کرتی تھیں ادائیں جن حسینوں کی　　اُبھاروں پر تھا جوبن اور عالم نوجوانی کا
ہلال و بدر کی کچھ حیثیت گر تھی تو بس یہ تھی　　کہ وہ چربہ تھا بچپن کا تو یہ خاکا جوانی کا
کلامِ روح پرور تھا کہ امرت رس کی چھالیں تھیں　　ثبوت اعجازِ عیسےٰ کا کرشمہ خوش بیانی کا
عنادل جن کے منموہن لبوں سے چہچہے سیکھیں　　سبق لے طوطیِ باغ عدن شکر فشانی کا
جو دلداری کی جاں تھی۔ بوالہوس کو اُنکو کہتے تھے　　"گلی ہیں ان کے ہے چھڑکاؤ تلواروں کے پانی کا"
اُمنگوں کی کسک جن کو اگر بےچین کردیتی　　نزاکت روک دیتی ولولہ جوشِ جوانی کا
نہ جن کے عشق میں تھا دخل شمہ بھر مجازی کا　　کہ جن کا نور تھا اک لمعہ شمعِ لامکانی کا
بغل کیا اے سگِ دنیا! وہ شکلیں دل کی زینت تھیں　　جو ارواحِ مُطہر کو تھیں مایہ شادمانی کا
شہودِ پاک کا منظر وجودِ خوب تھا جن کا　　لقب شایاں تھا جن کے واسطے جانِ جہانی کا
عزیزو! ہاں بتاؤ تو۔ کہاں وہ پیاری شکلیں ہیں؟　　مگر وہ بلبلہ تھیں ایک اِس دریائے فانی کا

کہیں مرگِ طبیعی ہے کہیں ہے مرگِ اسبابی
کہیں فتوے اطبا سے ہے مرگِ ناگہانی کا

غرض اِک پاؤ گے طاقت ہی جو حاوی زمانے پر
نہ سُنتی ہے جو حیلہ بے مثالی۔ نوجوانی کا

جو بنتی ہے وہ اک دن مٹنے والی ہی کوئی شے ہو
یہ کہنا سچ ہے۔ حادث ہی مرادف بلفظِ فانی کا

خموش اے کیفیؔ محزوں نہ پانی ڈال جوشوں پہ
مقامِ پند ہے یہ یا کہ موقعہ نوحہ خوانی کا

پر آدھی بات کو ذی عقل بے معنی بتاتے ہیں
نتیجہ چاہیے آخر کچھ اس طولِ بیانی کا

مَیں اس میں یہ کہونگا اے عزیز و صاحبِ دانش
تو کیا ماخذ یہی ہے لمبی چوڑی اس کہانی کا

کریں کس واسطے ہم کام اور کس کے لئے کوشش
بھروسا ہی نہیں ہے جب کہ اپنی زندگانی کا

نہیں اے دوستو! یہ اک غلط فہمی بلا کی ہے
مناسب دُور کرنا دل سے ہے اس بدگمانی کا

یقیں ہے ہم کو جب اس زندگی کو ہے فنا آخر
نکوکاری نہ کیوں مقصود ہو اس زندگانی کا

بھلا کس واسطے تم کام کل پر آج کا چھوڑو
یقیں کل تک نہیں ہے جب کہ تم کو زندگانی کا

کرو وہ کام فیضِ عام کے ہو نام دُنیا میں
اگر ہے آپ کو ارماں حیاتِ جاودانی کا

زمیں کی طرح دو ہر دل شکن کو گنج بدلہ میں
شجر ساں سنگدل کو دیجے پھل نقصاں رسانی کا

نہ میٹھا کس لئے بولیں کریں کیوں بات ہم ایسی
اثر پیدا کرے سامع پہ جو اک سرگرانی کا

جراحت تیغِ براں کی تو اکثر بھر بھی جاتی ہے
کبھی بھرتا نہیں ہے گھاؤ لیکن بدزبانی کا

کہیں کہنا زباں پر ہی نہ سارا حصر نیکی کا
زباں ہو ساتھ دل کے تب مزا ہے نیک بانی کا

ہے جینا چار دن تو پھر یہ کیوں بغض و حسد رنجش
ہے کے دن کے لئے یہ حوصلہ ایذا رسانی کا

تعصب کس لئے ہے؟ نفرت کیسی؟ جب اک حشر ہونا ہے
مسلماں اور ہندو کا ہر اک قاصی و دانی کا

خوشی اور خوش دلی میں آؤ اس کو کاٹ دیں بھائی
بقیہ ہے جو کچھ اس چند روزہ زندگانی کا

انجمن

کلکتہ کی ایک علمی انجمن میں مشارکت کے لئے لوگوں کو ترغیب دینے کے واسطے مندرجہ ذیل چند بند مولوی غلام یٰسین صاحب آہ دہلوی مقیم کلکتہ نے ایک جلسہ میں پڑھے ہیں۔ اور اب بہ نظر اشاعت دفتر مخزن میں ارسال فرماتے ہیں۔ اور ساتھ ہی چند تمہیدی سطریں لکھتے ہیں :-

ملک الشعرا ناصر بخاری کی غزل پر یاردو کے بند کہے گئے ہیں۔ یہ وہی ناصر بخاری ہے جس نے مکہ شریف جاتے ہوئے بغداد میں چند روز قیام کیا اور وہاں کے شاہی استاد خواجہ سلمان کو اپنے گروہ تلامیذ میں داخل کیا۔ یہاں اختصاراً بیان کیا جاتا ہے۔ اس کی حالت افلاس اس قابل نہ تھی کہ خواجہ سلمان جیسے کے گھر پر ملاقات کی غرض سے جاتا۔ اتفاقاً ایک دن دریائے دجلہ کی سیر کو خواجہ صاحب مع معززانِ شہر و شاگردانِ مشتاق تشریف لائے۔ آپس میں بڑی دیر سے یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ اب کے سال (کچھ دنوں پہلے) دجلہ بڑے زور و شور پر تھا اور خوب چڑھ آیا تھا۔ ناصر نے ان کے یہاں آنے کی خبر سن پائی۔ اپنی اسی خستہ حالی کا تحفہ لئے ہوئے جا پہنچا اور موقع پا کر سلام کیا خواجہ صاحب نے کہا "چہ کسی" ناصر نے جواب دیا کہ "مردِ غریب شاعرم" اسی اثنا میں خواجہ سلمان کی زبان سے یہ مصرع نکل گیا ع

دجلہ را امسال رفتارِ عجب مستانہ بود

پھر کر جو شاگردوں کی سمت نظر اٹھائی سب کو سرنگوں پایا کسی نے ثانی مصرع نہیں کیا۔ سب کے سب تفکر کے دریا میں غوطہ کھانے لگے۔ مایوسی کے عالم میں (بطورِ امتحان) سلمان نے ناصر سے کہا "اگر تو شاعر ہستی مصرعِ ثانیش بگو" ناصر نے کچھ آگے بڑھ کر کہا "بچشم" ؎

دجلہ را امسال رفتارِ عجب مستانہ بود
پائے در زنجیر و کف بر لب۔ مگر دیوانہ بود

خواجہ صاحب کی آنکھیں کھل گئیں دوڑ کے معانقہ کیا نام پوچھا اور بعد تعریف و ستایش سیدھے گھر لے آئے۔ اور بڑی عزت کی۔ اس کا شہرہ تو سنا ہی ہوا تھا اب عین الیقین کا رتبہ حاصل کرتے ہی اپنے کلام پر اصلاح لی اور ناصر بخاری کی شاگردی کا فخر پایا۔ ناصر نے اسی وقت یہ پانچ شعر کی غزل

کمی تھی جو بغداد میں عام زبان زد ہو گئی تھی اور جسے بغداد والے ہر گھر کی زبانوں پر پاتے تھے ✦

اجمال کی تفصیل ہے اور بات ہے ایسی ؎ اوروں سے تو مطلب نہیں میں کہتا ہوں اپنی
زورِ کششِ سلسلۂ الفتِ جاناں کھینچے لئے جاتا ہے مجھے سوئے گلستاں
پھولوں سے سروکار نہ کانٹوں سے عداوت گلچیں سے نہ ان بن ہے نہ بلبل سے محبت

مارا ہوسِ صحبتِ جاں پروریارانست
ورنہ غرض از بادہ پرستی نہ خماراست

دو چار اکٹھے ہوں اگر بات کے پورے پورے ہوں کبھی کام نہ رہ جائیں ادھورے
ہمت کی طرح چاہ کے اندازہ فزوں ہوں رکھتے ہی قدم بزم میں سرگرمِ جنوں ہوں
جو عشق کے بندے ہیں وہ غم کھائیں تو کھائیں جو مرد ہیں میداں میں وہ ہی آئیں تو آئیں

آتش نفساں قیمتِ میخانہ شناسند
افسردہ دلاں را بخرابات چہ کاراست

مشتاق ہیں مشتاق ہیں صورت تو دکھاؤ مطلب کی کہو۔ آؤ۔ ذرا ہاتھ ملاؤ
مل بیٹھ کے دس پانچ کرو کام کی باتیں کٹ جائیں کبھی مسئلۂ عشق میں راتیں
یاں آؤ تو معلوم ہو ایمان کی حالت ملجاؤ تو کثرت ہی بتا دے تمہیں وحدت

در مدرسہ کس را نہ رسد دعوئے توحید
منزل گہِ مردانِ موحد سرِ داراست

تم پہلے تو ملتے نہیں یہ دیکھ کے نقشا[1] ملتے ہو تو سنتے نہیں پھر دل کی کہیں کیا
اسلام ہے اسلام کی بو باس نہیں ہے بو باس ہے بو باس کا کچھ پاس نہیں ہے
جب شکل ہی بجوی ہو تو انداز سے حاصل؟ تم روح تو رکھتے نہیں اس سانچے سے حاصل؟

تسبیح چہ کار آید؟ وسجادہ چہ باشد؟
برمرکب بے طاقتِ روح ایں ہمہ بار است •

[1] یعنی انجمن کی جاتی ہے اور یہ انیس الاسلام کا جلسہ انہیں دعوت دیتا رہتا ہے جو شریک نہیں ہوتے ہیں ✦

اپنوں کا بُرا حال تو دیکھا نہیں جاتا
ہم جیسوں کو ہنسنا نہیں آتا نہیں آتا

کیوں دور پڑے پھرتے ہیں ملجائیں خدارا
شکل اپنی ہمیں بزم میں دکھلائیں خدارا

اور یہ نہیں تو آہ ہے کہدیں کہ نہ آنا
پھر آہ کی حالت کو نہ پوچھیں نہ ٹھکانا

ناصر اگر از ہجر بنالد عجبے نیست
مہجور زیار است و پریشان دیار است

کچکول

دشمن بھی دردِ دل میں نہ ہو مبتلا کبھی
ایسی بلا کسی پہ نہ ڈالے خدا کبھی

کب تک خزاں کا دور ہے قسمت میں اے کریم
بدلے گی بھی ہمارے چمن کی ہوا کبھی

مارا ہے مجھ کو پردے ہی پردے میں یار نے
افسوس بھول سے بھی نہ ظالم کھلا کبھی

رو رو دیا اثر بھی تو حالِ نزار پر
اُٹھ اُٹھ کے رہ گئے ہیں جو دستِ دعا کبھی

ممکن نہیں ہے نیم نگاہی پہ کیا جئے
ہوتا ہے رستہ چلتے یونہی سامنا کبھی

کیوں جی وہ کب ملوگے قیامت کب آئیگی؟
جو منہ سے کہہ چکے ہو وہ تم نے کیا کبھی

مجبور اُٹھ کے جاتے ہیں اس در سے نالہ کش
گر ھنا نہیں جو یاد بھی آئے صدا کبھی

افسوس گو مگو ہی رہا اپنا رازِ دل
ہم نے کہا کبھی نہ کسی نے سُنا کبھی

تھمتی نہیں ہے کاوشِ مژگاں کی چھیڑ چھاڑ
جاتا نہیں ہے زخمِ جگر کا مزا کبھی

شاعر کچھ اُس کی شانِ کریمی سے دُور ہے؟
پھر چین ہیں مزے ہیں جو سُن لے خدا کبھی

(حضرت آغا شاعر دہلوی)

دل چُرا کر آپ تو بیٹھے ہوئے ہیں چین سے
ڈھونڈنے والے سے پوچھے کوئی کیا جاتا رہا

مرگِ دشمن کا زیادہ تم سے ہے مجھ کو ملال
دشمنی کا لطف شکووں کا مزا جاتا رہا

ہو سکے مطلب نگاری کیا پریشاں طبع سے
ذہن میں آتے ہی حرفِ مدعا جاتا رہا

کس قدر اُن کو فراقِ غیر کا افسوس ہے
ہاتھ ملتے ملتے سب رنگِ حنا جاتا رہا

اب کئی دن سے وہ رسم و راہ بھی موقوف ہے
ورنہ برسوں نامہ بر آتا رہا جاتا رہا

(شیخ محمد اکرام)

(داغ)

شکوہ نہیں کسی کی ملاقات کا مجھے
تم جانتے ہو وہم ہے جس بات کا مجھے

ڈرنا کسی کا اور وہ بجلی کا کوندنا
موسم بہت پسند ہے برسات کا مجھے

(")

(")

وہ ڈرا ہوں یہ سمجھتا ہوں کہ دھوکہ تو نہ ہو
اب وہاں سے جو محبت کے پیام آتے ہیں

(")

(نامعلوم)

گیسوئے عنبریں جو شبِ تار بن گئے
بدرِ منیر اس میں وہ رخسار بن گئے

طرزِ خرام کہتی ہے انداز کو ترے
ہم فتنہ ہائے حشر بھی رفتار بن گئے

پاتے نہیں شفا وہ مسیحا کے ہاتھ سے
اُس چشمِ فتنہ زا کے جو بیمار بن گئے

ایمان و کفر عشق میں بالائے طاق ہیں
صد تارِ سبحہ دیکھے ہیں زنار بن گئے

حیرت سی ہے خموش بصدق و صفائے دل
آئینہ ساں جو طالبِ دیدار بن گئے

رہنا ہی بر کنار تھا موزوں میرے لئے
منظورِ بارگاہ جب اغیار بن گئے

تاب و تواں نے دیدیا مضطر کو جب جواب
تائب ہر اک گناہ سے ناچار بن گئے

(قریشی علی مرداں صاحب مظفر)

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُنکو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

(قاضی تفضل حسین) (غالب)

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہیں تیرا تو میری جان خدا ہے

(غالب)

(۷)

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئی آوارگی سے تم
بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

(غالب)

(۸)

دُنیا کے الم ذوق اُٹھا جائینگے
ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائینگے

جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے
اب جائینگے اوروں کو رُلا جائینگے

(میر لیاقت حسین ہمسر) (ذوق)

سرکش کو باغِ دہر میں نیکی کا پھل کہاں
دیکھو کہ سرو میں کبھی ہوتا ثمر نہیں۔

(منشی دیا نرائن نگم)

محفلِ یار سے اُٹھنے کو تو اُٹھے لیکن
درد کی طرح اُٹھے گر پڑے آنسو کی طرح

(۹)

لگائے ٹھٹھ کھڑی ہے نامرادی
تمنائے دلی نکلے کدھر سے

(۱۰)

روک دو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند
کس کی حاجت روا کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب
کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

(غالب)

طلبہ سے خطاب

ہمارے قابل دوست منشی احمد حسین خاں صاحب بی۔ اے نے چند روز ہوئے اسلامیہ کالج لاہور کے حصہ سکول کے طالب علموں کے ایک جلسہ میں جو طلبہ نے تعطیلات سرما کے شروع ہونے سے پیشتر منعقد کیا تھا اور جس میں انگریزی۔ اردو۔ فارسی۔ عربی نظمیں نہایت عمدگی سے بھرے مجمع میں پڑھکر سنائیں۔ مندرجہ ذیل اشعار پڑھے۔ جن میں انہوں نے طلبہ کو مخاطب کرکے بہت بیش قیمت نصیحت دی۔ یہ اشعار حاضرین جلسہ نے نہایت پسند کئے۔ ایک بند پر بالخصوص بار بار پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔ کیونکہ اس میں عالم شباب کے خطرات کا بہت خوبی سے ذکر کیا گیا ہے۔ ہم اس نظم کو کچکول کے ایک حصہ کو چھپنے سے روک کر جگہ نکالتے ہیں اس خیال سے کہ التوا میں اس کا لطف نہ جاتا رہے۔ کیونکہ وہ تقریب جو ان اشعار کے کہے جانے کا باعث تھی۔ پرانی ہو جائیگی:۔

نوروزِ جم سے بڑھ کے یہ جلسہ ہی بیگماں — اسلامیہ سکول ہمارا ہے میزباں
سب مہمان آج ہیں خورسند و شادماں — ہاں آشنائے لذتِ شکرانہ ہے زباں
ہم آئے اور آپ کا دل اس سے بڑھ گیا
لیکن ہمیں بھی یاد رہے۔ چاند چڑھ گیا

ہاں تم نے خوانِ خلق و محبت بچھا دیا — اور ہم کو جامِ شیرِ مسرت پلا دیا
تم گدڑیوں میں لعل ہو۔ تم نے دکھا دیا — جوہر بھرے ہیں تم میں یہ ہم کو جتا دیا
ہو بہرہ ور جو رحمتِ حق کے جلال سے
خالق بچائے آپ کو عین الکمال سے

اے نوجوانو! تم پہ لیاقت نثار ہو — تم قوم خوش نصیب کے دل کا قرار ہو
اسلامیہ سکول اگر لالہ زار ہو — ہر ایک تم میں سروِ لبِ جوئبار ہو
تم ہو ہمارے باغ کے پودے ہرے ہرے

تم سے خزاں کے ہاتھ الٰہی رہیں پرے

یارب ہمارے باغ کے یہ تو نہال ہیں — یہ نورِ عین ہم کو حرم کے غزال ہیں
ہر چند ماہِ عید ہیں یعنی ہلال ہیں — لیکن یہ پیش خیمۂ جاہ و جلال ہیں

یارب - ہم ان کو دیکھ کے ہوتے ہیں باغ باغ
یارب بنا دے قوم کے گھر کا انہیں چراغ

اک دشت پُر خطر ہے جوانی کا آستاں — چلتی ہیں اس میں روز بلا خیز آندھیاں
ہر ہر قدم پہ اس میں چمکتی ہیں بجلیاں — آتی ہیں دم زدن میں نحوست کی بدلیاں

صحرائے پُر خطر ہیں جوانی کے اے خدا
کر لو کرم کہ دُور رہے اِن سے ہر بلا

اور تم معلمانِ ستودہ صفات - ہاں — اس باغِ نوبہار کے اب تم ہو باغباں
تم ہم پہ مہرباں ہو - خدا تم پہ مہرباں — پھر پھول اس چمن کا ہو رشکِ گلِ جناں

یہ لاجواب باغ ہے اس کو سنگھار دو
یہ بے نظیر ہیرے ہیں اِن کو نکھار دو

تم نوجوانو! مجھ کو نہایت عزیز ہو — اور اِس کی وجہ یہ ہے کہ وافر تمیز ہو
گر یہ نہیں تو یاد رہے تم پشیز ہو — لیکن تمہارے اچھے ہیں نایاب چیز ہو

مرنے سے پہلے گر تمہیں سرسبز پاؤں گا
مَیں بامراد گلشنِ جنت کو جاؤں گا